12-5-31

نگار

قواعد رسالہ "نگار"

۱ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے

۲ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا

۳ خط کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیئے۔ جنپر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کردئے جاتے ہیں

۴ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے

۵ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہیئے

۶ سالانہ قیمت پانچ روپیہ۔ ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

تعداد صفحہ	یک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ	نرخنامہ اجرت اشتہارات	تعداد صفحہ	یک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ	(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے اُن کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا (۳) میعاد	تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۰ روپیہ	۱۲ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۳ روپیہ	اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے	ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۸ روپیہ	۵ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

(دوسرا اڈیشن)

حضرت نیاز کے ادبی متعدد مضامین اور افسانے شامل کیے گئے ہیں نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے۔

قیمت عہ

گہوارۂ تمدن

(دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جسمیں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیاے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول ۱عہ

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس زبان کی اسکی تخییل اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچی ہے قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و گمنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہو قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں علاوہ محصول ۱۰

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲

صحابیات

جسمیں عہد سعادت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات یکجا کر دیے گئے ہیں اسکا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲

تذکرہ خندۂ گل

مولفہ عبدالباری آسی جسمیں ۳۰۰ سے زائد اردو و فارسی کی ظریف شعراء کے حالات مع انکے لطائف و ظرائف اور انتخاب کلام کے درج ہیں قیمت محصول سے

بسم اللہ

نگار

خط و کتابت میں نمبر خریداری ضرور لکھئے ورنہ جواب کی توقع نہ رکھئے ——— مینیجر

جلد (۱۹) فہرست مضامین ماہ مئی سنہ ۱۹۳۱ء شمار (۵)

مضمون	مصنف	صفحہ
ملاحظات ———	اڈیٹر	۲
مطالعۂ حدیث تنقید صحیح کی روشنی میں	(ح ق گ)	۹
بھٹکی ——— (فسانہ)	شبلی ابراہیمی۔ ایم۔ اے	۲۲
اقبالنامہ جہانگیری	(عبدالمالک آروی)	۳۵
جنت کی حقیقت یا افسانۂ فردا	اڈیٹر	۴۴
زبان اردو کی تنزل کے اسباب	(قاضی خورشید عالم)	۵۷
انٹرویو ———	(شبلی افغانی)	۶۶
کوئی کہانی سناؤ	(ٹیگور)	۷۱
باب الاستفسار	اڈیٹر	۷۳
بقیہ ملاحظات ———	اڈیٹر	۸۲
ہنگامۂ کانپور (نظم)	علی اختر	۸۸
جھوٹ اور سچ کا مناظرہ (نظم)	نظیر لودھیانوی	۸۹
محبت کی شام (نظم)	روش صدیقی	۹۲
تیتری (نظم)	منظور حسین ماہر انصاری	۹۴
درد زندگی (نظم)	مجازی لکھنوی	۹۴
میکستان فطرت (نظم)	امین حزیں	۹۵
غزل ———	(ضیا مانک پوری)	۹۵
غزل ———	(فرخ بنارسی)	۹۶

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۹) ماہ مئی سنہ ۱۹۳۱ء شمار (۵)

ملاحظات

پھر مجھے لے چلا وہاں، دیکھو
دل خانہ خراب کی باتیں

۱۰ر مارچ کو تار ملا اور ۱۲ر کو ایک غیر معلوم زمانہ کے لئے لکھنؤ و فضائے لکھنؤ کو خیر باد کہکر تیسرے دن دولت آصفیہ کے پایۂ تخت میں پہونچگیا۔ خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس دن کے بعد واپس آجاؤں گا، لیکن جس طرح بقول غالب "عشق پر زور نہیں" اسی طرح حیدرآباد سے واپس آنے پر بھی انسان کا زور نہیں۔ چنانچہ باوجود انتہائی سعی و اضطراب کے ۱۸ر اپریل سے پہلے لکھنؤ نہ آسکا۔

ہر چند یہ روانگی و واپسی اصطلاح حکومت میں نہایت ہی "پرائیویٹ" تھی، اور مجھے اس کا ذکر صفحات نگار میں بھی نہ کرنا چاہیئے تھا، لیکن بعض اُن بدعنوانیوں اور بے پروائیوں کی بناء پر جو میرے زمانۂ غیر حاضری میں کارکنان دفتر و پریس کی طرف سے ظاہر ہوئیں اور جن سے یقیناً ناظرین نگار کو تکلیف پہونچی ہوگی، اس کا اظہار ضروری ہو گیا۔

اپریل کا نگار میری غیبت میں لکھا گیا اور چھاپا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاتب، پروف ریڈر

اور مصلح سنگ تینوں نے ملکر غلط نگاری اور غلط بینی کا پورا حوصلہ نکال لیا۔ ہر چند جب میں یہاں موجود ہوتا ہوں، اُس وقت بھی صحت کتابت وطباعت کا کوئی معقول انتظام نہیں کر سکتا، کیونکہ طباعت سنگی کی اس خصوصیت کو محو کرنا کسی انسانی طاقت کا کام نہیں۔ تاہم غلطیوں کا اتنا انبار یقیناً نہیں ہوتا اور اگر ہو بھی تو کم از کم مجھے تو یہ اطمینان رہتا ہو کہ میں نے اپنی پوری کوشش صرف کر دی تھی۔

دوسری غیر معمولی بات یہ ہوئی کہ اپریل کا رسالہ نہ پہونچنے کی شکایتیں کثرت سے موصول ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔ میں اب اُن حضرات کو کیا کہوں جو باوصف تکرار اعلان کبھی ۲۰ سے پہلے رسالہ نہ پہونچنے کی اطلاع نہیں دیتے، اور نہ نمبر خریداری تحریر فرماتے ہیں۔ میں تو صرف اپنے ہی دفتر والوں کو مورد الزام قرار دونگا کہ کیوں نہ انھوں نے زیادہ احتیاط سے کام لیا اور افسوس کرتا ہوں کہ کیوں نہ میں جلد واپس آگیا کہ خود فہرست کے خریداران کا مقابلہ لکھے ہوئے پتوں سے کر کے نگار کو روانہ کراتا

تیسری غلطی یہ ہوئی کہ اپریل کا نگار کم تعداد میں چھپوایا گیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ تبادلہ کے اکثر اخباروں اور رسالوں کو نہ پہونچ سکا، اور نہ اعزازی فہرست والوں کو۔ الغرض مجھے سخت افسوس و ندامت ہے اور وہ حضرات جن کو اب بھی اپریل کا نگار نہیں ملا ہے۔ ان سے التجا کرتا ہوں کہ وہ اپنا نمبر خریداری درج کر کے مجھے مکرر اطلاع دیں تاکہ میں کہیں سے جستجو کر کے رسالہ فراہم کروں، اور اگر اس میں کامیاب نہ ہوں تو نگار کی میعاد خریداری میں ایک ماہ کا اضافہ اور کر دوں۔

اسی دوران سفر میں نہایت ہی مختصر زمانہ کے لئے بنگلور جانے کا بھی اتفاق ہوا جو جنوبی ہند کا بہترین مقام مانا جاتا ہے، یہاں یکشبانہ روز قیام کا نتیجہ وہ مضمون ہے "جو جنت کی حقیقت" یا "افسانۂ فردا" کے عنوان سے اس ماہ کے رسالہ میں شائع ہو رہا ہے۔ اس مضمون میں جس فردوس کا حال بیان کیا گیا ہے، وہ حقیقتاً نہ اسلام کی جنت ہے نہ قرآن کی، بلکہ وہ جنت ہے مولویوں کی واعظوں کی، واضعین احادیث کی۔ اس لئے اگر کوئی شخص اس کو پڑھ کر برہم ہو تو اس راست یا دروغ کا عذاب بر گردن مولوی ہے۔ میں اس کا ذمہ دار نہیں۔

میں اپنے قیام حیدرآباد کے حالات قصداً نہیں بیان کرتا کیونکہ اگر ان کا ذکر کروں بھی تو وہی چند مخصوص احباب کی داستان لطف و کرم ہوگی جو اس سے قبل سال گزشتہ بیان کر چکا ہوں۔ یا پھر یمین السلطنتہ سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ کی مرحمت خسروانہ اور مکرمت بے پایاں کا افسانہ ہوگا جو نہ میرے لئے نئی بات ہے نہ اوروں کے لئے۔

میں کیوں گیا اور کس طرح واپس آیا۔ اس پر گفتگو کرنا تمناؤں کی طولانی داستان کا چھیڑ دینا ہے۔

دھوپ چھاؤں کا فسانہ شروع کر دیتا ہے اور نفسیات انسانی کے بعض اُن عجائب و غرائب سے بحث کرتا ہے، جن کا احاطہ غالباً ایک فانی انسان کے بس کی بات نہیں۔ لیکن ناشکر گزاری ہو یا نہ ہو۔ دل کی مخالفت ضرور ہو گی، اگر میں اسی سلسلہ میں، بے اختیارانہ طور پر حبیب محترم جناب نواب قدرت نواز جنگ بہادر کی یکسر خلوص و صداقت عنایات کا ذکر نہ کروں اور اُن چند لطیف صحبتوں کو بھول جاؤں جن کی یاد کا ماحصل اب سوائے اس خلش کے اور کچھ نہیں کہ

نیم بسمل اُس نے گر چھوڑا تو کچھ پروا نہیں
پر یہ غم ہے اعتبار دست قاتل اُٹھ گیا

کیسے خوش نصیب و خوشکام ہیں وہ لوگ جو نیم بسمل بھی نہیں اور "دستِ قاتل" کا اعتبار بھی رکھتے ہیں! آپ کو معلوم ہے اس کی صورت کیا ہوتی ہے؟ وہ یہ کہ دستِ قاتل اپنے ہاتھ میں ہو، نازک کلائیاں اپنی گرفت میں کسمسا رہی ہوں، نگاہوں کا تصادم ہو اِدھر سے حریصانہ اور اُدھر سے محجوبانہ، غیر محسوس طور پر بعد مکانی کم ہوتا جا رہا ہو اور آخرکار اس لمحۂ حیات پر نرمی سے اک "مہر دوام" ثبت کر دی جائے۔ ہے کوئی؟ جو میری حسرت دیدار کے ساتھ یہ پیام بھی اُن تک پہونچا دے کہ

تو نخل خوش ثمر کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش بُرید ند و با تو پیوستند

آہ "پیوستند"!

نواب فخر یار جنگ بہادر اور نواب صمد ریار جنگ بہادر کا ذکر میں اس دفعہ پھر کروں گا کہ انھوں نے پھر اپنے الطاف و کرم سے زیر بار کیا اور وہ بھی ایک سے زائد مرتبہ! اسی طرح مخلص صادق راجہ بھوانی پرشاد صاحب کا بھی شکریہ مجھ پر واجب ہے کہ اُنھوں نے میری زندگی کی چند تاریک ساعتوں کو رنگین و منور بنانے میں پوری کوشش سے کام لیا۔ لیکن دبی زبان سے یہ بھی عرض کروں گا کہ

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف
افسوس وہ دلربا ادائیں

اس سلسلہ میں، اُس شاعر بدہوش اور اس رند معصیت کوش کا بھی ذکر ضروری ہے جنھوں نے اپنی پست بادہ خواریوں کے ساتھ اپنی بلند شاعری سے بارہا لطف اندوز ہونے کا موقعہ دیا اور جناب ساحل بلگرامی اور حضرت اختر کا بھی شکریہ مجھ پر لازم ہے کہ ان میں ایک کی "دل پرسیاں" اور دوسرے کی "نیاز نوازیاں" کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں

جناب ہوش بلگرامی کا ذکر کیا کروں کہ اُن کی حیثیت تو ایک مرکزہ یا نواۃ (NUCLEUS) کی سی ہے۔ جس کے طواف میں مجھ ایسے بہت سے برقپارے (ELECTRONS) ہر وقت مصروف نیایش نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے ایک مہمان عزیز سید منظور صاحب کے ذکر سے ہیں نگار کے صفحات کو خالی نہیں رکھ سکتا جو میرے نزدیک کثرت عبادت و ریاضت سے بالکل دیوتا کی صورت اختیار کرتے جارہے ہیں، اور اگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے تو کسی نہ کسی وقت اُن کو "سنگ اسود" کی جگہ ملنے میں تو شک ہو ہی نہیں سکتا۔ سچ ہے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

میرے قیام حیدر آباد کے زمانہ کو اُنھوں نے اپنی اُن نمازوں سے جو قیام و قعود سے لیکر صاحب فراش ہونے تک کی تمام حالتوں میں ہر وقت ادا ہوتی رہتی تھیں اور ان دعاؤں، تسبیح خوانیوں اور گریہ زاریوں سے جو "گر تو قرآں بدیں نمط خوانی" کی بہترین تفسیر ہو سکتی ہیں۔ اس قدر معمور کر رکھا تھا کہ لبا اوقات مجھے اندیشہ پیدا ہو جاتا تھا کہ کہیں یہی مرض مجھے بھی نہ لاحق ہو جائے۔ اور لکھنؤ پہونچکر "خلع و طلاق" کی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑے۔ یوں تو جنون کی بہت سی قسمیں ہیں، اور ہر جنون اپنی جگہ بُرا ہے، لیکن اللہ محفوظ رکھے اس جنوں سے جو وہ اپنے متعلق نماز و وظیفہ کی صورت میں انسان پر طاری کردے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں سب سے بڑا عذاب انسان کے لئے یہ ہے کہ وہ ثواب آخرۃ کی امید میں اتنا سر کھپائے، درآنحالیکہ

عالم ہمہ افسانۂ او دارد و او ہیچ!

میں منظور صاحب کو مشورہ دوں گا کہ وہ روزانہ ہر نماز و تسبیح کے بعد ایک بار آئینہ میں اپنے خط و خال کا بھی مطالعہ کر لیا کریں کہ باچھیں پھاڑ پھاڑ کر گڑ گڑانے اور آنکھیں بھینچ بھینچ کر زبردستی آنسو نکالنے سے چہرہ کے اعصاب پر کیا اثر پڑتا ہے اور اگر اُن کے اعتقاد کے مطابق واقعی جنت میں کوئی بدنصیب حور اُن کو ملنے والی ہے تو ان کی یہ "عبادت زدہ" صورت دیکھ کر اُس غریب کو کتنا اپنی قسمت پر ماتم کرنا پڑے گا۔ اور خدا کی اس غلط بخشی کو دنیا کیا کہے گی۔ میں منظور صاحب سے معافی چاہوں گا۔ اگر اُن کو بُرا معلوم ہوا ہو، کیونکہ میرا مقصود حقیقتاً سوائے اس کے کچھ نہیں کہ

کوئی تو بات ہنسی کی نکلے،
خندۂ صبح قیامت ہی سہی،

مجھ سے بعض حضرات دریافت فرماتے ہیں کہ کیا مسلمانانِ ہند کے سنبھل جانے کی کوئی امید ہے؟ کیا کوئی صورت ہے کہ وہ وقت حاضر کی نزاکت سے بچکر جانِ سلامت لیجائیں۔ یعنی اب سوال یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت و جلال کو کیونکر واپس لاسکیں۔ بلکہ اسی کو غنیمت جان کر "باصد ہزار عجز و تمنا" چاہا جاتا ہے کہ وہ کسی طرح دنیا میں زندہ تو رہیں۔ اُن سے سانس کی آمد و شد کا استحقاق تو نہ چھینا جائے، وہ اپنی عمر طبعی تک تو پہونچنے کے لئے آزاد چھوڑ دیے جائیں۔ خواہ وہ آزادی ایک غلام ہی کی سی کیوں نہ ہو اور وہ حیات وہی کیوں نہ ہو جو راہ میں پڑے رہنے والے ایک گدائے معذور کو حاصل ہے۔ اللہ اکبر! یہ سوال اُس مذہب کے ماننے والوں کی طرف سے کیا جاتا ہے، جس کے پرچم پر سوائے انتم الاعلون کے اور کچھ منقوش نہ تھا۔ جسکا گرم سیر کارواں تلووں میں چبھ جانیوالے کانٹوں کے نکالنے کی بھی مہلت نہ دیتا تھا اور جس نے کوئی تعیین کسی منزل کی نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ انسان کو گمِ سفر رکھنا چاہتا تھا تاآنکہ وہ خود اُس تنہا رازِ آفرینش کو پالے جو انسان کو خدا بنا دینے والا ہے۔ میں یہ سنتا ہوں اور اعماق قلب سے خون کا ایک فوارہ جست کرکے میرے دماغ کی قوت ادراک کو میرے اعصاب بینائی کے انفعال و احساس کو تھوڑی دیر کے لئے سلب کرلیتا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ سر چکرانے لگتا ہے اور میں ایک بُت کی طرح خاموش ہو جاتا ہوں۔

یقیناً مسلمانانِ ہند اس وقت اُسی منزل سے گزر رہے ہیں جب ترقی و انحطاط کا نہیں بلکہ صرف مادی عناصر حیات کے بقاء و فنا کا سوال سامنے آتا ہے۔ اس لئے مجھے حیرت نہیں کہ وہ کیوں یہ سوال کرتے ہیں۔ بلکہ عبرت آتی ہے اس منظر پر کہ وہی قوم جس نے دنیا کو جینے کی نہیں بلکہ جلانے کی، زندہ رہنے کی نہیں بلکہ زندہ کر دینے کی راہیں بتائیں۔ آج اسی کے افراد اس خوف سے کانپ رہے ہیں کہ کوئی انھیں ہلاک نہ کر دے۔ اگر کوئی کہے کہ مسیح کا معجزہ جاں بخشی صرف شاعرانہ مبالغہ تھا، تو اسے باور کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی دعوے کرے کہ موسےٰ کے ید بیضا کی روشنی صرف ایک افسانہ تھی، تو اس کا بھی یقین ہو سکتا ہے اور اگر کوئی بتائے کہ سلیمان کی سطوت شاہانہ محض ایک داستان پارینہ ہے، تو اسکے باور کرنے میں بھی تامل نہیں ہو سکتا۔ لیکن خدارا کوئی بتائے کہ اس کا یقین کیونکر آسکتا ہے کہ وہ قوم جس کا ایک ایک فرد مسیحی جاں بخشیوں، موسوی نور افروزیوں اور سلیمانی سطوتوں سے بہت بلند دنیا کی حقیقتوں کو بروئے کار لاکر، محض انسانی عظمت و جلال پر مہر دوام ثبت کرنے کا دعوے رکھتا تھا وہ آج انحطاط کی اُس منزل پر پہونچ گئی ہے کہ اس دنیا میں غلامانہ سانس لیتے ہوئے بھی اس کا کلیجہ ایک مجرم کی طرح کانپ رہا ہے! حقیقت یہ ہے کہ

کم ہوتے ہیں زمانہ میں ایسے بھی انقلاب

آج اگر بودھ اور زردشت کے ماننے والے رام و کرشن کی پوجا کرنیوالے موسیٰ و مسیح کے متبعین صفحۂ عالم سے محو ہو گئے ہوتے تو جائے حیرت نہ تھی کیونکہ وہ تعلیم مذہب اخلاق جواب سے کئی ہزار سال قبل دنیا کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ اس درجہ مکمل نہ تھی کہ وہ زیادہ عرصہ تک ارتقاء انسانی کا ساتھ دے سکتی اور اسلئے اس کو یقیناً بے روح ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن پیروان اسلام کا زوال جبکہ ابھی صرف ۱۳۵۰ سال کا زمانہ گزرا ہے اور جس کی تعلیم کو تکمیل دین اور اتمام نعمت سے تعبیر کیا جاتا ہے، یقیناً سخت حیرتناک واقعہ ہے اور ایک شخص کے لئے یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے اسباب کا سراغ کہاں اور کیونکر لگائے۔

اسلام کے علاوہ جتنے مذاہب عالم میں گزرے ہیں، ان سب کی تعلیمات۔ دنیا کی طرف سے بالکل خالی الذہن ہو کر پیش کی گئی تھیں، یعنی وہ یہ تو چاہتے تھے کہ انسان حسن اخلاق سے اپنی اہلی و قبائلی زندگی کو خوشگوار بسر کرے، لیکن نہ ان کے سامنے انسان کا وہ مستقبل تھا جسے سیاست و تجارت یا دولت و ثروت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور نہ وہ اس اصول ارتقاء کو جانتے تھے جو دماغ انسانی کو ایک جگہ قائم رکھنے والی چیز نہیں۔ اس راز کو صرف اسلام نے سمجھا اور دنیا کو سمجھایا کہ انسان نام گوشت پوست کا نہیں ہے جو فنا ہو جانیوالی چیزیں ہیں۔ بلکہ انسان نام ہے اسکی فراست و بصارت کا، اقدام عمل کا، نہضت و ارتقاء کا اور تمام کائنات پر فرمانروایانہ انداز سے چھا جانے کا اور یہی وہ حقیقت تھی جسے مذہبی زبان میں تشبیہاً و استعارتاً جنت و فردوس، خلود و مسرت، جنات نعیم اور کوثر و سلسبیل سے تعبیر کیا گیا۔ آخرت و قیامت سے ہمیشہ ایک قوم کا انجام و نتیجہ مراد لیا گیا اور موت کے بعد بقاء کا مفہوم بھی انھیں روایات عروج کو بتایا گیا جو انسان کی حقیقی داستان حیات ہے۔ لیکن چونکہ ترقی و عروج حکومت و ثروت انسان میں ہمیشہ تمرد و سرکشی اور انحطاط اخلاق کا باعث ہوا کرتی ہے، اس لئے اسی کے ساتھ اسلام نے وہ تعلیم بھی پیش کی۔ جو مادی ترقی کے ساتھ اخلاقی صحت کو بھی قائم رکھنے والی تھی۔ اور وہ تعلیم عدل و مساوات تھی۔ عہد رسالت سے قبل اس نوع کی عملی تعلیم کا وجود کسی زمانہ میں نہیں پایا گیا اور عہد حاضر کی تمام ترقیاں اسی اصول پر استوار ہوئی ہیں۔

پھر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دنیا کی تمام ترقیاں اسلام ہی کے وضع کردہ اصول پر مستحکم ہو رہی ہیں تو خود مسلمان کیوں اس سے محروم رہے اور ہیں۔ ممکن ہے کوئی شخص اس کے جواب میں تاریخ ماضی کو پیش کر کے مسلمانوں کی گذشتہ ترقی کو بطور ثبوت سامنے لائے، لیکن مجھے اس میں

کلام ہے کہ واقعی کبھی مسلمانوں نے کوئی ترقی ایسی کی جس کو ہم اسلامی اصول کی پابندی کا نتیجہ بتا سکیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کا دور ترقی دو تین سو سال سے زائد قائم نہ رہ سکا۔ حالانکہ اگر اصول ترقی وہی ہوتے جو اسلام نے بتائے تھے تو جو ترقی ہوئی تھی، وہ نہ صرف یہ کہ علی حالہا قائم رہتی بلکہ آج ساری دنیا پر چھائی ہوئی نظر آتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی اس بے بہا تعلیم پر کسی نہ کسی حد تک صرف ۳۰ سال تک عمل رہا اور امیر معاویہ کے تخت نشین ہوتے ہی عدل و مساوات کا قانون بالکل اُٹھ گیا اور اس کی جگہ استبداد و قہرمانیت نے لیلی۔ پھر اس کے بعد مسلمانوں نے جو ترقی کی وہ صحیح اسلامی ترقی نہ تھی۔ بلکہ ملوکانہ تسلط تھا۔ جو دنیا کے مختلف حصوں پر قائم ہوا اور چند دن میں اپنی عمر طبعی کو پہنچکر فنا ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ جس تعلیم کو پورے تیس سال بھی پختہ ہونے کے لئے نصیب نہ ہوں، وہ کیونکر دنیا میں استوار ہو سکتی تھی اور کس طرح اس کا اثر قوم کے تمام افراد پر پڑ سکتا تھا، علی الخصوص اُس وقت جبکہ سلاطین وقت اور شاہانِ عصر کی تمام ستمرانیوں اور بے اعتدالیوں کا ساتھ دینے کے لئے ہمارے علماء کرام کی ساری جماعت موجود تھی اور جو جھوٹی حدیثیں وضع کر کے، لغو و مہمل فقہی مسائل گڑھ گڑھ کر استبداد کو تقویت پہونچا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب عہد نبوی سے قریب تر زمانہ میں ہمارے رہبروں کا یہ حال رہا ہو تو زمانہ مابعد میں اس کی دنارت کس حد تک نہ پہونچ گئی ہوگی۔ چنانچہ آپ ہندوستان، ایران، مصر ترکی، اسپین کی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہاں حکمرانی کا انداز کیا تھا اور کیا حقیقتاً ان میں اصول عدل و مساوات پر قانون جہانبانی کی بنیاد قائم کی گئی تھی جو اسلام نے بتائی تھی؟ نہ انھوں نے اسلام کی صحیح تعلیم کو سمجھا، نہ اُنھوں نے قانون و شریعت کے اصول پر نگاہ کی، نہ ان کو یہ معلوم ہوا کہ فطرت اور تمدن کا باہمی رشتہ کیا ہے اور نہ اُنھوں نے کبھی اس حقیقت پر غور کیا کہ زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے خود اپنے آپ میں کس قدر تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس کا جو قدرتی نتیجہ پیدا ہونا چاہیئے تھا، وہی ظاہر ہوا، یعنی اسلام نام ہو گیا، صرف مخصوص لباس و وضع کا مقررہ مراسم و رواج کا اور علماء کرام نے اس سادہ فطری مذہب کو، اُس دور وحشت کا مذہب بنا دیا، جب انسان مذہب کے نام سے صرف علم الاصنام پیدا کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ آج اگر کوئی غیر مذہب والا۔ اسلام کی ان کتابوں کو دیکھے جو ہمارے ہاں کے علماء فقہا اور محدثین نے تصنیف فرمائی ہیں تو وہ حیران رہ جائے گا کہ کیا انھیں روایات و مسائل کی بنا پر اسلام کو فطری مذہب اور محمد کو خاتم النبین ثابت کیا جاتا ہے۔

(بقیہ ملاحظات صفحہ ۴۲ پر)

مطالعۂ حدیث تنقید صحیح کی روشنی میں

(مسلسل)

اسرے یا معراج

سبحان الذی اسرٰی بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصٰے الذی بارکنا حولہ لنریہ[له]
من اٰیٰتنا انہ ھو السمیع البصیر

قرآن کریم - بنی اسرائیل - آیت اول

بخاری و مسلم میں انس سے ایک عجیب و غریب روایت بیان کی گئی ہے جس کا میں یہاں لفظ بہ لفظ ترجمہ کرتا ہوں:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - میرے سامنے براق لایا گیا اور وہ ایک جانور ہے سفید رنگ کا گدھے سے اونچا اور خچر سے چھوٹا - سم وایاں رکھتا ہے - جہاں تک اس کی نگاہ پہونچتی ہے - میں اس پر سوار ہوا اور بیت المقدس تک آیا - اور وہاں اس جانور کو حلقے سے باندھ دیا جس سے اور پیغمبر اپنے جانوروں کو باندھا کرتے تھے - پھر میں مسجد کے اندر گیا - اور دو رکعتیں نماز پڑھیں - بعد اس کے باہر نکلا تو جبرئیل دو برتن لیکر آئے - ایک میں شراب تھی اور ایک میں دودھ، تو میں نے دودھ پسند کیا - جبرئیل نے کہا تم نے فطرت کو اختیار کیا - پھر جبرئیل ہمارے ساتھ آسمان پر چڑھے، تو فرشتوں نے کہا دروازہ کھولو - پوچھا کون ہے - جبرئیل نے کہا جبرئیل - انھوں نے کہا

[له] پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصٰے تک لیگیا جسکے گرد و نواح کو ہم نے برکت دی ہے تاکہ اسکو اپنی نشانیاں دکھلائے - اور وہ سمیع و بصیر ہے - اسرٰے کے معنی صرف چلانے چلنے کے ہیں جسطرح بات کے معنی گھر میں رہنے کے ہیں - مگر عرب میں ہمیشہ دونوں کے معنی سے رات کا چلنا اور رات کو گھر پر رہنا مراد لیا جاتا ہے - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجد اقصٰے کا نشان باقی نہ تھا بلکہ وہ جگہ مزبلہ تھی - اس کا اشارہ بارکنا حولہ میں ہے کہ اگرچہ مسجد اقصٰے کا نشان باقی نہ تھا مگر اس کا نواح مقدس و بابرکت تھا - اور جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد اقصٰے اصلی شان میں دکھلائی گئی - اسی کا اشارہ "لنریہ من اٰیاتنا" میں ہے - معراج کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں - اور اسلئے اسرٰے اور معراج میں بے انتہا فرق ہے - اسرٰے علحدہ چیز ہے اور معراج علحدہ - قرآن سے اسرٰی ثابت ہے مگر معراج ثابت نہیں - رسول اللہ صلعم کا بیت المقدس کو اپنی اصلی حالت میں دیکھنا اور وہاں آنا - یہ سب اسرار خداوندی ہیں - جن پر ایمان لانا پڑے گا -

تمہارے ساتھ دوسرا کون ہے۔ جبرئیل نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرشتوں نے پوچھا وہ بلائے گئے تھے، جبرئیل نے کہا ہاں بلائے گئے تھے پھر دروازہ کھولا گیا۔ ہمارے لئے اور ہم نے آدم علیہ السلام کو دیکھا۔ انھوں نے مرحبا کہا اور میرے لئے دعا کی بہتری کی۔ پھر جبرئیل ہمارے ساتھ چڑھے دوسرے آسمان پر اور دروازہ کھلوایا۔ فرشتوں نے پوچھا کون ہے انھوں نے کہا جبرئیل۔ فرشتوں نے کہا تمہارے ساتھ دوسرا شخص کون ہے انھوں نے کہا محمد ہیں۔ فرشتوں نے کہا کہ انکو حکم ہوا تھا بلانے کا جبرئیل نے کہا ہاں پھر دروازہ کھلا تو میں نے دو خالہ زاد بھائیوں کو دیکھا۔ عیسٰے بن مریم اور یحییٰ بن ذکریا کو۔ انھوں نے کہا مرحبا اور میرے لئے بہتری کی دعا کی۔ پھر جبرئیل ہمارے ساتھ تیسرے آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھلوایا۔ فرشتوں نے کہا کون ہے۔ جبرئیل نے کہا جبرئیل۔ فرشتوں نے کہا تمہارے ساتھ دوسرا کون ہے جبرئیل نے کہا محمد ہیں۔ فرشتوں نے کہا کیا ان کو پیغام دیا گیا تھا۔ بلانے کے لئے۔ جبرئیل نے کہا ہاں۔ پھر دروازہ کھلا تو میں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا۔ اللہ نے حسن کا آدھا حصہ انکو دیا تھا۔ انھوں نے مرحبا کہا مجھکو اور نیک دعا کی۔ پھر جبرئیل ہم کو لیکر چوتھے آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھلوایا۔ فرشتوں نے پوچھا کون ہے۔ کہا جبرئیل۔ پوچھا تمہارے ساتھ کون ہے کہا محمد ہیں۔ فرشتوں نے کہا کیا وہ بلوائے گئے ہیں۔ جبرئیل نے کہا ہاں۔ پھر دروازہ کھلا تو میں نے ادریس علیہ السلام کو دیکھا۔ انھوں نے مرحبا کہا اور اچھی دعا مجھکو دی۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہم نے اٹھالیا ادریس کو اونچی جگہ پر۔ پھر جبرئیل ہمارے ساتھ پانچویں آسمان پر چڑھے۔ فرشتوں نے پوچھا کون۔ کہا جبرئیل۔ پوچھا اور کون ہے تمہارے ساتھ۔ انھوں نے کہا محمد ہیں۔ فرشتوں نے کہا کیا خدا نے آپ کو پیغام بھیجا ہے۔ آنے کے لئے۔ جبرئیل نے کہا ہاں۔ پھر دروازہ کھلا تو میں نے ہارون علیہ السلام کو دیکھا۔ انھوں نے مرحبا کہا اور مجھکو نیک دعا دی۔ پھر جبرئیل ہمارے ساتھ چھٹے آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھلوایا۔ فرشتوں نے پوچھا کون ہے۔ کہا جبرئیل۔ پوچھا تمہارے ساتھ اور کون ہے۔ کہا محمد ہیں۔ فرشتوں نے کہا کیا وہ بلوائے گئے ہیں۔ انھوں نے کہا ہاں۔ پھر دروازہ کھلا تو میں نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا۔ انھوں نے کہا مرحبا اور اچھی دعا دی۔ پھر جبرئیل ہمارے ساتھ ساتویں آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھلوایا۔ فرشتوں نے پوچھا کون ہے۔ کہا جبرئیل۔ پوچھا تمہارے ساتھ اور کون ہے کہا محمد ہیں۔ فرشتوں نے پوچھا کیا وہ بلوائے گئے ہیں۔ پھر دروازہ کھلا تو میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا۔ وہ تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ اپنی پیٹھ کا بیت المعمور کی طرف۔ اور اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے جاتے ہیں جو کبھی واپس نہیں آتے۔ پھر جبرئیل ہم کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس تک لے گئے۔ اس کے پتے اتنے بڑے ہیں جیسے ہاتھی کے کان۔ اور اس کے پھل جیسے بڑا گھڑا۔ جس میں دو مشک سے زیادہ پانی آتا ہے۔ پھر جب اس درخت کو اللہ کے حکم نے ڈھانکا تو اس کا حال ایسا ہوگیا کہ کوئی مخلوق اسکی خوبصورتی کو بیان نہیں کرسکا۔ پھر اللہ نے ڈالا میرے دل میں جو کچھ ڈالا۔ اور پچاس نمازیں ہر رات اور دن میں فرض کیں۔ جب میں وہاں سے اترا اور

اور حضرت موسےٰ تک پہونچا تو انھوں نے پوچھا تمہارے پروردگار نے کیا فرض کیا تمہاری امت پر۔ میں نے کہا پچاس نمازیں فرض کیں۔ انھوں نے کہا پھر لوٹ جاؤ اپنے پروردگار کے پاس اور تخفیف چاہو۔ کیونکہ تمہاری امت کو اتنی طاقت نہ ہوگی۔ اور میں نے بنی اسرائیل کو آزمایا ہے اور انکا امتحان لیا ہے۔ میں لوٹ گیا اپنے پروردگار کے پاس اور عرض کیا اے پروردگار تخفیف کر میری امت پر۔ اللہ تعالےٰ نے پانچ نمازیں گھٹا دیں۔ میں لوٹ کر حضرت موسیٰ کے پاس آیا اور کہا کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے پانچ نمازیں معاف کر دیں۔ انھوں نے کہا تمہاری امت کو اتنی طاقت نہ ہوگی تم پھر جاؤ اپنے رب کے پاس۔ آپ نے فرمایا میں اسی طرح برابر اپنے پروردگار اور حضرت موسیٰ کے بیچ میں پھرا۔ یہانتک کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا اے محمد وہ پانچ نمازیں ہیں ہر دن و رات میں اور ہر ایک نماز میں دس نماز کا ثواب ہے تو وہی پچاس نمازیں ہوئیں اور جو کوئی شخص نیت کرے نیک کام کرنے کی پھر اسکو نہ کرے تو اسکو ایک نیکی کا ثواب ملے گا اور جو کرے تو اس کو دس نیکیوں کا۔ اور جو شخص نیت کرے برائی کی پھر اس کو نہ کرے تو کچھ نہ لکھا جائے گا اور اگر کر بیٹھے تو ایک ہی برائی لکھی جاوے گی۔ آپ نے فرمایا پھر میں اترا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا۔ انھوں نے کہا پھر جاؤ اپنے پروردگار کے پاس اور تخفیف چاہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں اپنے پروردگار کے پاس پھر پھر کر گیا۔ یہاں تک کہ میں شرما گیا اس سے۔" (مسلم۔ ابن ماجہ)

اس حدیث کے لکھنے کے بعد سب سے پہلے یہ اطمینان دلانا ضروری ہے کہ اس روایت کا ماننا شرطِ ایمان نہیں ہے۔ اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا نہ کسی معتزلہ کا قول نقل کر رہا ہوں۔ بلکہ اشعریوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اسرے[1] کا انکار قرآن کا انکار ہے۔ اور کفر ہے۔ مگر معراج کا انکار کفر نہیں۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر اب اس حدیث پر مختلف زاویوں سے نگاہ ڈالنا ہے۔

یہ روایت کن بزرگ سے چلی

یہ تو حدیث سے ظاہر ہے کہ اس روایت کے بیان کرنیوالے انس ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ انس نے خود کس سے سنا۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تو یا تو اس کو معراج کی شب کے دوسرے روز سنا ہوگا جبکہ آنحضرت نے اسکا اظہار قریش کے سامنے کیا اور ایک فتنہ کا باعث ہوا۔ یعنی مسلمانوں میں تشکک و ضعف ایمان پیدا ہوا اور قریش کو آنحضرت پر مضحکہ کرنے کا موقع ہاتھ لگا۔ یا پھر آپ نے اس روایت کو آخر زمانہ میں بیان کیا۔ پہلی صورت میں انس کا سننا نا ممکن ہے۔ کیونکہ انس مع اپنی والدہ ام سلیم مدینہ میں آنحضرت کی خدمت میں جب حاضر ہوئے تو وہ ایک طفل صغیر السن تھے۔ یعنی ان کی عمر تقریباً سات سال کی تھی۔ کیونکہ آنحضرت کی رحلت کے وقت انکی عمر ۱۸ اور ۱۹ کے درمیان تھی۔

---

[1] اسرے اور معراج کے فرق کے لئے میرا پہلا نوٹ دیکھو (صفحہ ۹ پر)

اگر انھوں نے اس کا تذکرہ بعد کو رسول اللہ صلعم کے زبانی مدینہ میں سُنا۔ تو سوال یہ ہے کہ اس روایت کو آنحضرت نے مجمع میں بیان کیا۔ یا انس کے کان میں کہا۔ قیاس یہ ہے کہ اگر آپ نے معراج کا واقعہ دہرایا ہوگا۔ تو اس کے سننے والوں میں سے کم سے کم حضرت عائشہ ضرور رہی ہوں گی۔ مگر ان کا سکوت کچھ معنی ضرور رکھتا ہے۔ حالانکہ وہ حدیث بیان کرنے میں انس اور ابو ہریرہ سے کم نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انس نے اسکو آنحضرت سے نہیں سنا۔ بلکہ بخاری[۱] کی دو اور روایتوں سے پایا جاتا ہے کہ یا تو انھوں نے ابو ذر سے سنا۔ اور یا مالک بن صعصعہ سے اور یا دونوں سے۔ افسوس کہ میرے پاس اسوقت صحیح بخاری نہیں۔ البتہ صحاح کی دوسری کتابیں بجز ترمذی اور نسائی کے ہیں۔ ابو ذر کی حدیثوں میں میں نے معراج کی حدیث تلاش کی تو مسلم میں صرف اس قدر روایت میرے ہاتھ آئی۔

"میں نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا کیا آپ نے پروردگار کو دیکھا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ تو نور ہے میں اس کو کیسے دیکھتا۔ دوسری روایت میں ہے کہ میں نے ایک نور دیکھا"

بہت ممکن ہے کہ یہ میری تلاش کا قصور ہو۔ مگر اس تلاش میں ابو ذر کی ایک حدیث میرے ہاتھ لگی ہے جو اپنی ندرت میں معراج کی اس حدیث کو بھی مات کرتی ہے وہ یہ ہے:۔

"رسول اللہ صلعم نے اپنے صحابہ سے ایک دن فرمایا تم جانتے ہو کہ یہ سورج کہاں جاتا ہے۔ انھوں نے کہا اللہ اور اس کا رسول خوب جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا یہ چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اپنے ٹھہرنے کی جگہ پر عرش کے تلے آتا ہے اور سجدہ کرتا ہے۔ پھر اسی حال میں رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس سے کہا جاتا ہے اونچا ہو جا اور لوٹ جا جہاں سے آیا ہے۔ پس وہ نکلتا ہے اپنی جگہ سے۔ پھر ملتا ہے اسی طرح۔ ایک بار اسی طرح چلیگا اور لوگوں کو کوئی فرق اسکی چال میں معلوم نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ اپنے ٹھہرنے کی جگہ آویگا عرش کے تلے اس وقت اس سے کہا جاویگا اونچا ہو جا اور پچھم کی طرف نکل۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم جانتے ہو یہ کیا ہوگا۔ یہ اس وقت ہوگا جب کسی کو ایمان لانا فائدہ نہ دیگا۔ جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو۔ یا اس نے نیک کام نہ کئے ہوں اپنے ایمان میں"

اگر ابو ذر ایسی ہی حدیثوں کے اہل ہیں تو ان سے معراج کی روایت میں جو کچھ بھی نہ بیان ہو تھوڑا ہے۔ لہذا ابو ذر سے تو ہمیں رخصت مانگ لینی چاہیئے۔ اب رہ گئے مالک بن صعصعہ۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب معجزات نبوی دیکھنے کے پہلے مجھے ان کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ کیونکہ انکی کوئی حدیث مسلم۔ موطا۔ ابن ماجہ۔ ابو داؤد میں مجھے ملی ہی نہیں۔ نہ کہ معراج کی حدیث۔ سید سلیمان صاحب خود فرماتے ہیں کہ یہ مہاجر نہ تھے بلکہ انصار تھے۔ لہذا انصار ہونے کی حیثیت

---

[۱] بقول مصنف معجزات نبوی۔

سے ان کا معراج کے واقعے کے بعد رسول اللہ صلعم سے کچھ سننا مشہور ہے ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حدیث میں اگر کوئی روایت ہو تو وہ انس کی ہے ۔ مگر ان کو معلومات براہ راست حاصل نہیں ہوئیں اور جن لوگوں سے انھوں نے سنا ہے ۔ مثلاً ابو ذر اور مالک بن صعصعہ ان میں سے کسی کی تائیدی روایت میری نظر سے حدیث میں نہیں گذری ۔

ابن عباس اور ابو ہریرہ کی روایات معراج

ہر چند کہ ابن عباس و ابو ہریرہ کا زمانہ انس سے بھی بعد کا ہے ۔ یعنی ابن عباس سال ہجرت میں پیدا ہوئے تھے اور ابو ہریرہ فتح خیبر کے زمانہ میں مسلمان ہوئے ۔ مگر انھوں نے جو کچھ سنی سنائی باتیں معراج کی بیان کی ہیں ۔ اس سے کم سے کم اس قدر روشنی ضرور پڑتی ہے کہ ان دونوں اصحاب نے رسول اللہ کی سیر ہفت آسمان کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ وہ آنحضرت کا انبیاء سے ملنا بیت المقدس میں بتا گئے ہیں ۔

مسلم میں معراج کے متعلق ابو ہریرہ کی روایت حسب ذیل ہے :-

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنے تئیں دیکھا حطیم میں اور قریش مجھ کو میری سیر کا حال پوچھ رہے تھے تو انھوں نے بیت المقدس کی کئی چیزیں پوچھیں جنکو میں بیان نہ کر سکا ۔ مجھے بڑا رنج ہوا ۔ ایسا رنج کبھی نہیں ہوا ۔ پھر اللہ تعالےٰ نے بیت المقدس کو اٹھا کر میرے سامنے کر دیا ۔ میں اسکو دیکھنے لگا اب جو بات وہ پوچھتے تھے میں بتا دیتا تھا اور میں نے اپنے تئیں پیغمبروں کی جماعت میں پایا ۔ دیکھا تو موسےٰ علیہ السلام کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے ہیں وہ ایک شخص ہیں میانہ تن و توش کے اور گٹھے ہوئے جسم کے جیسے شنوہ کے لوگ ہوتے ہیں ۔ اور دیکھا عیسےٰ ابن مریم کو وہ بھی کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے ۔ سب سے زیادہ مشابہ ان کے میں عروہ بن مسعود ثقفی کو پاتا ہوں اور دیکھا تو حضرت ابراہیم نماز پڑھ رہے ہیں ۔ سب سے زیادہ مشابہ ان کے تمہارے صاحب ہیں ۔ آپ نے اپنے تئیں فرمایا ۔ پھر نماز کا وقت آیا تو میں نے امامت کی اور سب پیغمبروں نے میرے پیچھے نماز پڑھی ۔ پھر جب میں نماز سے فارغ ہوا تو ایک بولنے والا بولا ۔ اے محمد یہ مالک ہے جہنم کا داروغہ اس کو سلام کرو ۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے خود ہی سلام کیا ۔"

دوسری روایت میں ہے :-

"میں موسےٰ علیہ السلام سے ملا ۔ پھر آپ نے انکی صورت بیان کی ۔ میں خیال کرتا ہوں آپ نے یوں فرمایا وہ لمبے چھریرے تھے یا پر گوشت سیدھے بال والے جیسے شنوہ کے لوگ ہوتے ہیں ۔ اور فرمایا کہ میں عیسےٰ علیہ السلام سے ملا ۔ پھر آپ نے انکی صورت بیان کی وہ میانہ

قد تھے۔ سرخ رنگ جیسے ابھی کوئی حمام سے نکلا ہو اور آپ نے فرمایا میں ابراہیم علیہ السلام سے ملا تو میں انکی اولاد میں سب سے زیادہ ان سے مشابہ ہوں۔ آپ نے فرمایا میرے پاس دو برتن لائے گئے ایک میں دودھ تھا اور ایک میں شراب۔ اور مجھ سے کہا گیا جسکو چاہو پسند کرو۔ میں نے دودھ کا برتن لے لیا۔ فرشتے نے کہا تم کو راہ ملی فطرت کی۔ اور جو تم شراب اختیار کرتے تو تمہاری امت گمراہ ہو جاتی"۔

ابن عباس کی روایت ذرا مختصر ہے اور یوں ہے:۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وادی ازرق پر گذرے تو پوچھا کون سی وادی ہے لوگوں نے کہا وادی ازرق آپ نے فرمایا گویا میں موسےٰ علیہ السّلام کو دیکھ رہا ہوں۔ اور وہ اتر رہے ہیں چوٹی سے اور آواز سے لبیک پکار رہے ہیں۔ پھر آپ ہرشا کی چوٹی پر آئے (ایک پہاڑ کا نام شام اور مدینے کے راستے پر حجفہ کے قریب) آپ نے پوچھا کون سی ٹیکری ہے۔ لوگوں نے کہا یہ ہرشا کی ٹیکری ہے۔ آپ نے فرمایا گویا میں دیکھ رہا ہوں یونس کو وہ ایک سرخ اونٹنی گٹھی ہوئی پر سوار ہیں۔ اور ایک جبہ پہنے ہیں بالوں کا اور وہ لبیک کر رہے ہیں۔

دوسری روایت یوں ہے:۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس رات مجھے معراج ہوئی میں موسےٰ بن عمران پر گذرا وہ ایک لمبے آدمی تھے گھونگروالے بال جیسے شنوہ کے آدمی ہوتے ہیں۔ اور میں نے دیکھا عیسےٰ ابن مریم کو وہ میانہ قد تھے اور رنگ ان کا سرخ و سپید تھا اور بال ان کے سیدھے تھے۔ ایک اور روایت میں ہے اور بیان کیا مالک کا اور ذکر کیا دجال کا۔

کیا معراج روحانی تھی یا جسمانی

جیسا میں نے اسریٰ کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے۔ اسرے چلانے و چلنے کے معنی میں آتا ہے اور اسی سے سیارۃ نکلا ہے اور سیارہ عربی میں دو کرنیوالے اور قافلے والے کو کہتے ہیں اسریٰ پر رویا کی تاویل عربی میں بالکل غلط اور لغو ہے۔ رویا دیکھنا ہے اور اسریٰ چلانا یا چلنا ہے۔ لہذا قرآن کے ماننے کیلئے یہ ماننا ضروری ہے کہ آنحضرت راتوں رات مکہ سے بیت المقدس یعنی مسجد اقصےٰ تک چلائے گئے۔ اور اس کے بعد اگر انھوں نے وہاں خدا کی آیات کو ملاحظہ کیا تو اس پر رویا کی تاویل جائز ہو سکتی ہے۔ یہ سوال کہ کیا آنحضرت کے لئے یہ ممکن تھا میری بحث سے خارج ہے۔ کائنات قدرت میں ایسی باتیں معمولی ہیں۔ اور اللہ کا اپنے بندے کو لمحہ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانا اس سے زیادہ ممکن ہے۔ جتنا ہوائی جہاز پر لندن سے کراچی ایک ہفتے میں واپس آنا و جانا۔ ہمارا ایمان چونکہ قرآن پر ہے ہم کو اس بات کو مانے بغیر چارہ نہیں کہ اسرے رویا نہ تھا بلکہ ایک چیز تھی جو معجزات و خصائص نبوی میں سے ہے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو معمولی خواب ہر انسان دیکھتا ہے اس میں خصائص نبوت کیا پیدا ہوئی۔

اور اس پہ قرآن شریف کا اسقدر شد و مد سے ذکر اور پھر اس پر کفار قریش اور نو مسلموں میں فتنہ و شور و شغب ہونا سب مہمل اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ مگر رویا کی تاویل کرنے والے عام مسلمان ہی نہیں بلکہ اکثر صحابی بھی ہیں۔ اور اسکی ضرورت غالباً انس کی روایات نے پیدا کی ہے۔ کیونکہ آسمان پر جانا نہ چند لمحے[۵۱] میں نور کے لئے ممکن ہے۔ نہ فرشتوں[۵۲] کے لئے۔ اور انسان کا تو سوال ہی نہیں۔ ایک کی تردید میں سائنس و علم ہے۔ اور دوسرے کی تردید میں خود قرآن۔ لامحالہ اس کی تاویل کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ان سارے عجائبات کو یا تو غلط سمجھا جائے یا اس کو خواب سے زیادہ وقعت نہ دیجائے۔ مینے پہلی صورت کو اختیار کیا ہے اور اسی کی بحث اس مطالعہ میں ہے پہلی صورت کے اختیار کرنے پر مجھے صرف ایک حدیث سے مقابلہ کرنا رہ جاتا ہے جو انس سے مروی ہے مگر مقطوع و غیر مرفوع و شاذ۔

انس کے روایت کی تنقید

تنقید کرنے سے پہلے ایک ناقد کا فرض ہے کہ وہ اس پر غور کرے کہ تا نہ باشد چیزکے مردم نگویند چیزہا کی رو سے ہر روایت کی حقیقت ہے کیا بے سر و پا روایتیں ہی اپنی راویوں کی جسمانی اور دماغی حالت کے ساتھ ان کی نیت کا پتہ دیتی تھی۔

انس آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک نو عمر غلام تھے۔ اور انکی کثرت حدیث کی سب سے بڑی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ان کے مخاطب دوسری اور تیسری پشت کے مسلمان تھے۔ یعنی تابعین و متبع تابعین۔ انس کا زیادہ تر قیام بصرہ میں تھا۔ مگر قرین قیاس ہے کہ ابتدائی زمانہ انھوں نے شام میں گذارا۔ کیونکہ انس کے سلسلہ اسناد میں شہاب زہری اور قتادہ حسن بصری۔ نافع عروہ اور موسےٰ ابن عباس۔ یہ سب ہی انس کے دیکھنے والے تھے۔ مگر ان لوگوں نے معراج کی حدیثوں کو بیان نہیں کیا ہے۔ سوائے شہاب زہری اور قتادے کے۔ امام مالک نے اپنی موطا میں زہری سے زیادہ اعتناء کیا ہے۔ مگر موطا میں معراج کی یہ حدیث میری نظر سے نہیں گذری۔ موطا میں عجیب تر بات یہ ہے کہ اس میں صرف زہری سے ہی روایتیں ہیں۔ بلکہ مروان حتے کہ عبدالملک سے بھی روایتیں ہیں۔ حالانکہ مروان اور عبدالملک دشمنان اہل بیت میں سے تھے۔ آل مروان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حضرت علیؑ پر تبرہ کہنے کی بدعت خطبہ میں پیدا کی۔ چنانچہ خود مسلم کی اکثر روایتوں جبراً سے ظاہر ہوتا ہے کہ آل مروان کے خلیفہ جو مدینے میں مقرر ہوئے تھے۔ وہ علانیہ حضرت علی پر ممبر پر تبرا کہتے تھے۔ اور کہلواتے تھے۔ زہری ابوہریرہ کی طرح مروان اور عبدالملک کے وظیفہ خوار تھے۔ لیکن انس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ عیسائیوں کا

---

۵۱ سب زمین پر سب سے قریب ستارے کی روشنی ہزاروں برس کے بعد پہونچتی ہے۔

۵۲ تعرج الملئکۃ والروح الیہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ (قرآن)

بطریق یوحنا نحوی دمشقی جو عبدالملک کے زمانے میں گذرا ہے۔ اس نے مسلمانوں سے اکثر مناظرے کئے ہیں اور اسلام سے اس کے مباحث اب بیروت میں چھپ گئے ہیں۔ اگر یہ کتابیں جعلی نہیں ہیں تو ان تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری کے مسلمانوں میں معراج کا کوئی عقیدہ نہ تھا ورنہ یوحنا ضرور اس کا ذکر کرتا۔ اور اس کی تردید کرتا۔ حالانکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی معجزہ والی بات نہیں کی۔ سوائے شق القمر اور اسرائے بیت المقدس کے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ باتیں کہاں سے دوسری صدی ہجری میں پیدا ہوئیں۔

زنادقہ کی ابتدا اور اُن کے مکائد

سنہ ۱۴۲ ہجری میں جب طبرستان دوبارہ فتح ہوا۔ تو وہاں کے باشندے جو اس وقت تک محض خلافت کو جزیہ دیتے تھے اور اپنے قدیم مذہب مجوسیت پر قائم تھے۔ براہ راست عربوں کے محکوم ہوئے۔ دہقانوں اور امرائے عجم کی ایک کثیر تعداد قتل ہوئی۔ ابھی یہاں امن نہ ہوا تھا کہ دیلم میں جہاں کے لوگ مجوس مذہب کے پابند تھے فتنہ برپا ہوا۔ جو دراصل سبب خراسان کے مقنع کے قتل کے ضمن میں تھا۔ ایک زمانہ تک بابک خرمی اور اسکے مجوسیوں سے اور مسلمانوں سے سخت مقابلہ رہا۔ بالآخر دیلم دوبارہ فتح ہوا۔ اور ایران سے مجوسیت کا پورا قلع قمع کیا گیا۔ انکی زیادہ تعداد بغداد میں منتقل کردی گئی اور جو کچھ اپنے وطن میں رہے انکے لئے سوائے اس کے اور کوئی صورت باقی نہ رہی کہ وہ در پردہ اپنے مذہب پر رہیں اور ظاہر میں مسلمان۔ یہ جماعت بڑھتی گئی۔ اور اس جماعت کو تاریخ میں زنادقہ کہا گیا ہے۔ یہ فرقہ ثانوی عقیدہ کی تبلیغ کے ساتھ اسلام و عرب و رسول کی اہانت کو اپنا فرض جانتا اور مختلف صورتوں سے اس کا پروپگنڈا کیا کرتا تھا۔ ہارون رشید کے زمانے تک تو یہ جماعت خفیہ رہی مگر مامون رشید کے زمانہ میں زنادقہ ظاہر ہوئے اور اپنے باطل عقیدے کی اس درجہ تبلیغ کی کہ بقول کریمر اس زمانہ میں امرائے عرب زندیقیت پر فخر کیا کرتے تھے۔ گویا وہ ایک قسم کا فیشن ایبل عقیدہ تھا۔ زنادقہ نے شعوبیت کا سوال اٹھایا یعنی وہ قرآن سے یہ ثابت کرتے تھے کہ عرب کو عجم پر کوئی فوقیت نہیں۔ بلکہ عرب بدترین قوم ہیں۔ زنادقہ کی پوری تاریخ یہاں بیان نہیں کی جا سکتی۔ تفصیل کے لئے گولڈزیہر۔ نولڈیکی۔ فوڈن کریمر کی کتابوں سے استفادہ کیا جائے۔ زنادقہ نے ایک کمیٹی بنائی جسکا اصل مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ہر قسم کے اتہام لگائے جائیں۔ اور اگر صراحتاً بیان نہ ہوسکیں تو ہجو ملیح کیجائے۔ یہ لوگ خرافات سے خرافات باتیں اور بدترین اتہامات سے آنحضرت کو منسوب کرتے تھے۔ زنادقہ کا دور دورہ مہدی خلیفہ عباس سے لیکر متوکل تک رہا ہے۔

حدیث کی تدوین ہارون رشید کے زمانہ میں ہوئی ہے۔ اس کو ذہن نشین کرلو اور یہی کہ زنادقہ کا عقیدہ خرفہ مانویہ کا عقیدہ تھا۔ خرفہ مانویہ جو مجوس اور نصرانیت سے مل کر بنا ہے۔ اس میں مانی کے نسبت یہ خیال ہے کہ اسنے آسمان پر چڑھ کر خدا کے چہرے کی ملاقات کی۔ اور اپنی سیاحت میں ہفت آسمان کے متعدد پیغمبروں سے ملا اور وہیں سے

اس کو شب لعیت ملی۔ تو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ زنادقہ نے مسلمانوں سے کہا۔ تم کو کس بات پر ناز ہے کیا تمہارے مذہب میں بھی ہماری طرح پانچ وقت کی نمازیں ہیں۔ اور کبھی تمہارے پیغمبر نے بھی ساتوں فلک کی سیاحت کی ہے۔

بھولے بھالے مسلمانوں نے دانتوں کے نیچے انگلی دبالی۔ ان کو یاد تھا کہ ایک زمانہ میں یہودی بھی ایسا ہی طعنہ دیا کرتے تھے کہ واہ بڑے شریف مسلمان ہیں کہ زانی کو چند درے لگاکر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں دیکھو۔ زانی قتل کردیا جاتا ہے۔ ابھی وہ اسی حیص بیص میں تھے کہ قرآن کو کس طرح محرف کہا جائے کہ یہ ایک دوسرا تازیانہ لگا۔ بیچین ہو گئے۔ جوش آگیا۔ اتفاق ایسا کہ حدیثیں ڈہل رہی تھیں تو کیا محدثین سے اتنا بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ کہ وہ بھی رسول اللہ صلعم کو آسمان پر چڑہادیں اور پانچ وقت کی نماز کے بجائے پچاس وقت کی رکھادیں۔ الغرض ایک واعظ نے بصرہ یا کوفہ کی جامع میں یہ شگوفہ چھوڑ دیا۔ بس پھر کیا تھا دنیائے حدیث میں آگ لگ گئی۔ اور رفتہ رفتہ ایک اچھا خاصہ مواد اس فسانہ کے لئے مہیا ہوگیا۔ سوڈیڑھ سو برس بعد جب بخاری نے آنکھ کھولی تو اس پر بڑی بڑی مہریں شنعہ اسناد کی لگ چکی تھیں۔ لہذا اُنھوں نے اس کو داخل دفتر کرلیا۔ اگر یہ نتیجہ نہ نکالو تو پھر تصویر کا دوسرا رُخ تو یعنی زنادقہ نے تو اس حدیث کو وضع کیا تا کہ مسلمانوں کے رسول پر مضحکہ کرنے کا موقع ہاتھ آئے۔

۱۔ اسلام کا صاف عقیدہ تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان عالم برزخ میں رہتا ہے۔ اور عالم برزخ کی جگہ نہ اول آسمان پر ہے اور نہ دوسرے پر نہ تیسرے پر۔ اس لئے یا تو اس روایت کے رو سے وہ چھ سات .... مرے ہی نہیں اور یا مرے بھی تو دیوتا بنکر ہر ایک آسمان پر بٹھادئے گئے ہیں۔ یہ عقیدہ مجوس ومشرکین کا ہے مسلمانوں کا نہیں۔

۲۔ اسلام میں آسمان نہ چمڑے کا ہے نہ شیشے کا نہ لوہے کا نہ لکڑی کا۔ اور وہ نہ اس طرح زمین کے اوپر تنا ہے جیسا پرانے زمانے کے بیوقوفوں کا خیال تھا۔ آسمان زمین کے اوپر بھی ہے اور نیچے بھی۔ داہنے بھی اور بائیں بھی۔ اور سما ایک تقابل مجملہ ہے اور اس سے ہر چیز جو ہمارے سر کے اوپر دکھائی دے۔ حتے کہ بادل بھی وہ سب سما میں داخل ہیں۔ مگر زمین سے آسمان پر جانا کسی کے لئے ممکن نہیں۔ اس لئے کہ سما درحقیقت جدا محیط ہے۔

۳۔ اسلام کا خدا انسان کی طرح آسمان پر تخت نشین نہیں ہے۔ وہ ایک لامکان ہے۔ نور ہے۔ اللہ نور السموات والارض۔

۴۔ سورۂ النجم کا تعلق سورہ بنی اسرائیل سے کچھ بھی نہیں ایک واقع کو دوسرے سے ملا نا وہی کرسکتا ہے جو تاریخ نزول قرآن سے واقف نہیں۔

۵۔ سورۃ اسرائے میں اور نہ قرآن میں کہیں پچاس یا پانچ وقت کی نماز کا ذکر ہے۔ خود سورۃ اسرائے میں اوقات صلوٰۃ کی تعین اس طرح کی گئی ہے۔ اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل وقرآن الفجر کان مشہودا سورۃ اسرائے کی قبل کی سورتوں میں ہی متعدد بار اوقات صلوٰۃ[1] میں قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا

(۱؎ فٹ نوٹ صفحہ ۰ ا پر ملاحظہ ہو)

ومن اناں الیل آچکا ہے۔ اور اس پر سارے قرآن میں کہیں زیادتی نہیں کی گئی۔ البتہ اس کا اندیشہ تھا کہ قبل از غروب وقبل از طلوع میں ذرا ابہام اوقات کی اور زیادہ صراحت کردیجائے۔ چنانچہ بعض جگہ اس کو اطراف النہا یا غیر فی النہار سے ظاہر کیا ہے۔ اور بعض جگہ جیسے سورۃ اسرائے میں ہے اسکی اور زیادہ صراحت عصر کے وقت کی کردی ہے۔ اسرئے کی آیت میں اقم الصلوٰۃ ہے نہ صلوٰۃ۔ یعنی واحد ہے نہ جمع۔ جس سے مراد ایک ہی مسلسل نماز کے ہوسکتے ہیں۔ اور کئی وقتوں کی نماز مراد نہیں ہوسکتی۔ ورنہ جہاں نماز میں بولی گئی ہیں جیسے حافظوا علی الصلوٰت والصلوٰۃ الوسطےٰ۔ اس میں دیکھو معنوں نماز کو جمع سے کہا اور پھر اس میں سے ایک مخصوص نماز کے لئے واحد کیا رہا یہ سوال کہ پانچ وقت کی نماز پھر کہاں سے پیدا ہوئی۔ وہ علٰحدہ مضمون ہے۔ یہاں صرف اسقدر کافی ہے کہ قرآن میں پانچ وقت کی نماز کی کوئی سند نہیں۔

"حق گو"

(نگار) ہمارے فاضل دوست نے واقعۂ معراج کے متعلق جو اظہار خیال کیا ہے اس سے ہمیں بھی اتفاق ہے۔ لیکن صرف اسی حد تک جہاں تک حدیث کا تعلق ہے اور ہر شخص بہ اول نظر معلوم کرسکتا ہے کہ واقعۂ معراج کی شرح وبسط میں جو احادیث بیان کیجاتی ہیں، وہ کسی طرح درخور یقین نہیں ہوسکتیں، لیکن مجھے اس میں کلام ہے کہ اسرئے و معراج دو علٰحدہ چیزیں ہیں۔

کیا بخاری ومسلم سے جو حدیث نقل کی گئی ہے، وہ سورۂ بنی اسرائیل کی اُس اولین آیت سے متعلق نہیں ہے جسے "آیت اسرئے" کہا جاتا ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو پھر اسرئے و معراج کی تفریق کیسی اور اگر غلط ہے تو پھر بتایا جائے کہ معراج کا واقعہ قرآن کی کس آیت میں بیان کیا گیا ہے؟

ظاہر ہے کہ اگر معراج آیت اسرئے سے متعلق نہ سمجھی جاتی تو اسکی اہمیت اس قدر نہ بڑھ سکتی تھی اور محض حدیث کی بنا پر وہ اس قدر مہتم بالشان چیز نہ بنجاتی۔ یہ واقعہ ہے کہ تمام مفسرین نے بخاری ومسلم کی انس والی حدیث کو اسی آیت کی تفسیر سمجھا اور اسی لئے معراج کے انکار کو نص قطعی کا انکار سمجھا گیا۔ جن لوگوں نے انس والی روایت کو (اس لحاظ سے کہ کوئی عقل انسانی اس کی صحت پر یقین نہیں کرسکتی) نظر انداز کردیا۔ وہ یقیناً ذوق سلیم کے مالک تھے، لیکن افسوس ہے کہ وہ اس قدر

ا؎ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷ ملاحظہ ہو) محترم سلطنت معجزات نبوی نے یہ عجیب بات اپنی نوٹ میں لکھی ہے کہ معراج کے قبل صبح وشام کی نماز نہیں تھی۔ کیا یہ بات قرآن سے ثابت ہے۔ حالانکہ ابو حنیفہ نے تو سورہ روم کی آیت سے پانچ وقت کی نماز ثابت کی ہے یعنی سورۃ اسرئے کی قبل کی سورۃ کہ۔

جرات اپنے اندر نہ رکھتے تھے کہ آیت اسرٰے کے عام متبادر مفہوم سے ہٹکر اس کے حقیقی معنی پر غور کرتے اور انھیں یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی کہ واقعۂ اسرٰے کا انکار قرآن کا انکار ہے۔ اُن کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی آیت اسرٰے میں کوئی ایسی بات پاتے تھے جو دل میں کھٹکتی تھی اور جس کے متعلق انھیں خیال تھا کہ لوگ باور نہ کرینگے۔ اس لئے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ معراج کی حدیث سے انکار کرنا اور اسرٰے والی آیت کا وہی مفہوم لینا جو عام طور پر لیا جاتا ہے، کیا معنی رکھتا ہے۔

ہمارے فاضل مقالہ نگار نے بھی اسرٰے و معراج میں تفریق کی ہے اور وہ بھی اس کے قائل ہیں کہ اسرٰے کے انکار قرآن کا انکار ہے۔ اور رسول اللہ کا "بیت المقدس کو اپنی اصلی حالت میں دیکھنا اور واپس آنا" جیسا کہ آیت اسرٰے سے سمجھا جاتا ہے اسرار خداوندی ہیں جن پر ایمان لانا پڑے گا۔ مجھکو اسی سے اختلاف ہے اور اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

اسرٰے والی آیت یہ ہے:۔

"سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہ لنریہ من آیاتنا۔"

"یعنی پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندہ کو ایک رات مسجد حرام سے مسجد اقصےٰ تک جس کے گرد و نواح کو ہم نے مبارک بنایا ہے تاکہ ہم اس کو اپنی نشانیاں دکھلائیں۔"

اس سلسلہ میں تین باتیں تحقیق طلب ہیں۔ ایک یہ کہ مسجد حرام سے کیا مراد ہے، مسجد اقصےٰ کا کیا مطلب اور لیجانے سے کیا مقصود ہے۔ اس کو غالباً سب نے تسلیم کر لیا ہے کہ مسجد حرام سے مراد واقعی مسجد حرام نہیں ہے بلکہ اس سے مدعا شہر مکہ ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مسجد اقصےٰ سے واقعی بیت المقدس کی وہ مسجد مراد لیجائے (جس کے متعلق ہمارے فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں کہ اُس وقت اس کا نشان تک باقی نہ تھا اور وہ جگہ مزبلہ تھی) اگر لفظ اقصےٰ کے لغوی معنی پر غور کیا جائے اور اس کے معنے دُور یا انتہا کے لئے جائیں تو جس طرح مسجد حرام سے مکہ مراد لیا گیا ہے اسی طرح مسجد اقصےٰ سے دُور کی مسجد یعنی مدینہ سمجھا جا سکتا ہے جہاں بعد کو رسول اللہ نے راتوں رات ہجرت فرمائی اور مسجد نبوی تعمیر کی گئی۔ اس لئے یہ آیت اگر مکی مانی جائے تو اس کو ہجرت نبوی کی پیشین گوئی سمجھنا چاہیے اور اگر بعد ہجرت مدینہ میں نازل ہوئی تو واقعۂ ہجرت کا بیان۔

بہرحال میرے نزدیک معراج کا کلام مجید میں کسی جگہ ذکر نہیں ہے اور اسرٰے والی آیت ہی سے لوگوں نے واقعۂ معراج کو تصنیف کیا، درآنحالیکہ اس آیت میں کوئی بات ایسی اُلجھاؤ کی

نہیں ہے جس پر معراج جسمانی یا روحانی کی بحث چھیڑی جائے۔ صاف صاف طور پر اس میں مکہ سے مدینے کی ہجرت کا حال بیان کیا گیا ہے جو ایک واقعہ تھا اور حقیقتاً اسلام کے لئے بہت مبارک و مسعود ثابت ہوا۔

نیاز

سمن بغرض انفصال مقدمہ

مقدمہ نمبر ۶ سنہ ۱۹۳۱ء

بعدالت جناب پنڈت کرشن انند صاحب بہادر خفیفہ اوناؤ

دیال دیو بختاور قوم اہیر ساکن گنگا کھیڑہ مزرعہ بادی کھیڑہ پرگنہ پوروہ ضلع اوناؤ — مدعی

بنام ردہو۔ بنام

ردہو ولد رتا قوم تیلی ساکن بادی کھیڑہ پرگنہ پوروہ ضلع اوناؤ — مدعا علیہ

ہرگاہ مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت مار عہ کے دائر کی ہے لہذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ ۴ر ماہ مئی سنہ ۱۹۳۱ء بوقت دس بجے دن اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل اُمور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جس کے ساتھ کوئی اور شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعوے مدعی مذکور کی کرو اور ہرگاہ وہی تاریخ جو تمہارے احضار کے لئے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس تم کو لازم ہے کہ اپنے جواب دعوے کی تائید میں جن گواہوں کی شہادت پر یا جن دستاویزات پر تم استدلال کرنا چاہتے ہو اُسی روز انکو پیش کرو۔

مطلع رہو کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ بغیر حاضری تمہارے مسموع اور فیصل ہوگا۔

آج بتاریخ ۱۳ر ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

دستخط حاکم بخط انگریزی — (مہر عدالت)

وقت حاضری بدفتر سب ججی اوناؤ — ۱۰ بجے سے ۴ تک

بھٹکی

(۱)

سنہرے اناج کے پے در پے کھیتوں کا ایک سلسلہ تھا جس کے کنارے کنارے گھنے اور سرسبز درختوں کی قطاریں تھیں۔ خزاں کا نیلا آسمان سایہ افگن تھا اور اُس انتہائی نقطہ پر جہاں آسمان اور زمین ملتے ہوئے نظر آتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نقاش نے مختلف وضع اور قطع کے پہاڑوں کے ایک سلسلہ کی تصویر کھینچدی ہے۔ اُن میں سے بعضوں کی شکلیں ایک مغرور، سربلند، زرہ پوش سپاہی کی سی معلوم ہوتی تھیں، بعض بعض اپنے شانوں کو جھکائے ہوئے گیانی سادھوؤں سے ملتے جلتے تھے اور بعض ایسے معلوم ہوتے تھے کہ جیسے کوئی شرمیلی چڑیا اپنی نظروں کو نیچی کئے ہوئے ہے۔ یہ بڑی بڑی پتھر کی چٹانیں گرچہ اٹل، بے جان، اور بے زبان تھیں۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی وضع قطع سے کسی بات کا اظہار کر رہی ہیں۔

سورج ڈوب رہا تھا۔ اُسکی آخری کرنیں بادل کے سفید ٹکڑوں پر ضیا پاشی کر رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھک کر درختوں کے سرے پر جھرنے کی طرح برس پڑتی ہیں۔ وہاں کے کھیتوں کے کنارے کنارے ایک تنگ راستہ چلا گیا تھا۔ تھوڑے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا جھرنا دکھائی دیتا تھا جس کے دونوں کناروں پر سنہری بالو کے ذرات بکھرے ہوئے تھے۔ چند بھینسیں اور گائیں اس چھوٹے سے چشمہ پر کھڑی پانی پی رہی تھیں دو قدیم نسل کی لڑکیاں اُن کی رکھوالی کر رہی تھیں۔ ان کا سیاہ فام جسم ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں میں کالے پتھر کی طرح چمک رہا تھا۔

سمارش اور مادہابی دونوں اس تنگ راستہ پر ٹہل رہے تھے۔ مادہابی انتہائی مسرت کے ساتھ اُن رنگوں کو دیکھ رہی تھی۔ جنکو غروب آفتاب کے شاندار نظارہ نے پیدا کر دیا تھا اُس نے کہا "جب ہم لوگ کلکتہ میں ہوتے ہیں، تو ہم لوگ بھول جاتے ہیں کہ دنیا میں سورج کا نکلنا اور ڈوبنا بھی کوئی چیز ہے"

سمارش نے ہنس کر کہا "ہملوگوں کو وہاں آفتاب سے بہت کم واسطہ پڑتا ہے اس لئے اُس کو ہملوگ آسانی سے بھلا دے سکتے ہیں۔ لیکن ہملوگ ہر روز کے کھانے میں بھی زیادہ وقت ضائع نہیں کرتے۔ کیا ہم لوگ یہ غور کرنے کے لئے توقف کرتے ہیں کہ یہ دال اور چاول کہاں سے آتے ہیں؟ یہ سنہرے اناج کے

کھیت ہم لوگوں کو یاد دلاتے ہیں مگر جیسے ہی وہ ہماری نظروں سے دور ہو جاتے ہیں، دنیا میکڈم کے بنائے ہوئے اُصول کے مطابق سڑکوں، پتھروں اور سمنٹ کے بڑے بڑے مکانوں سے بھری ہوئی معلوم ہونے لگتی ہے۔

یکایک چھوٹے راستہ کی انتہا پر ایک چھوٹی سی جماعت زور زور سے گفتگو کرتی ہوئی اور قہقہہ لگاتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اور ان دونوں کی گفتگو بغیر کسی نتیجہ پر پہونچے ہوئے رُک گئی۔ اس جماعت میں بھاری، سنتھالی، اور دوسرے لوگ تھے۔ اس جماعت کے زیادہ تر لوگ گھر کی بنی ہوئی چوڑی چوڑی سرخ کنارے کی موٹی موٹی ساریاں، اور دھوتیاں پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سرخ اور سیاہ مضبوط دھاگے زیبائش کے لئے لگائے گئے تھے اور مرد عورت دونوں اپنے بالوں کو سنوار کر چکنے ہوئے جوڑے باندھے ہوئے تھے۔ رنگین موتیوں کے لمبے لمبے مالے اُن کے زیب گلو تھے۔ ان میں سے بہت سے سر پہ گھڑے لئے ہوئے تھے۔ عورتیں شیر خوار بچوں کو بھی لئے ہوئے تھیں۔ جن کو انھوں نے اپنی پیٹھ پہ ایک سرخ رومال کے ذریعہ سے باندھ لیا تھا اور سبز سبز ترکاریوں، چاول، اور دال کی ٹوکریاں جنکو انھوں نے دیہات کے میلہ میں خریدا تھا ان کے سروں پہ رکھی ہوئی تھیں۔

اسی بھیڑ میں ایک نوجوان لڑکی ایک مرد کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ اُس کے سر پہ ایک ٹوکری تھی لیکن کوئی بچہ نہ تھا۔ وہ ایک کم قیمت انگلستان کی بنی ہوئی چھینٹ کی تنگ انگیا اور ایک لانبی ساری پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ اور گھنے بالوں کا جوڑا چوڑے سرخ فیتہ سے مضبوطی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اُس کے ماتھے پر قشقہ کا ٹیکا تھا اور اُس کی چپٹی ناک، گول منھ، اور سیاہ رنگ صاف اُسکی نسل کا پتہ دے رہی تھیں۔ وہ کسی سائنس یا صنعت کے اصول کے مطابق مشکل سے خوبصورت کہی جا سکتی تھی۔ لیکن وہ اپنی پُر کیف صحت اور اٹھتی ہوئی جوانی میں بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی، اُس کی گفتگو، اُس کی چال، اور اُس کی ادائیں بالکل بیباکانہ، فطرتی اور دلکشی سے معمور تھیں۔

جب وہ مادہابی کے قریب پہونچی تو اُس نے کہا "سلام میم صاحب! آپ کو آدمی کی ضرورت ہے؟"

اُس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے مادہابی نے شوخی کے ساتھ سمارش سے کہا "دیکھتے ہو یہ چھوکری مجھ کو میم صاحب سمجھتی ہے۔"

سمارش نے جواب دیا "تم ایک حبشی حسن کے سامنے ایسی ہی معلوم ہوتی ہو۔"

اس اثنا میں لڑکی متانت کے ساتھ کھڑی رہی۔

"کیا تم ہندوستانی ہو؟" مادہابی نے دریافت کیا "تم نے ہندوستانی زبان کیونکر سیکھ لی؟"

لڑکی نے ہندوستانی یا غیر ہندوستانی ہونیکے متعلق کچھ نہیں کہا۔ لیکن مادہابی کے سوال کے آخری حصہ کا جواب دیتے ہوئے اُس نے کہا "ہم ہندی اپنا پہلا میم صاحب کا پاس سیکھا"۔

اُس کی ٹوٹی پھوٹی زبان اور لب ولہجہ سے بالکل واضح تھا کہ وہ ہندوستانی نہ تھی۔

"تم کیا کام کر سکتی ہو؟" مادہابی نے پوچھا "میں برتن دھو سکتی ہوں"۔ اُس نے جواب دیا۔ اب اُس کے ساتھی نے بڑھ کر کہا "حضور جو کچھ آپ چاہیں گی وہ کرے گی"۔

سمارش بیتاب ہو رہا تھا بول اٹھا "نوکروں کا شہر میں کال نہیں ہے جو تم سڑک پر بات چیت کر رہی ہو۔ اب ہم لوگوں کو جلدی چلنا چاہیئے"۔

مادہابی نے جواب دیا "ٹھہرو! چونکہ وہ خود آئی ہے۔ اس لئے وہ زیادہ نہیں مانگیگی۔ کھو کھا کو کھلانے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ لڑکی مضبوط معلوم ہوتی ہے"۔

سمارش نے غصہ سے کہا "تمہارا جو جی چاہے کرو تم ہمیشہ روپیہ برباد کرنیکی فکر میں لگی رہتی ہو"۔

مادہابی نے اُس کے غصہ کا کوئی خیال نہیں کیا اور لڑکی سے پوچھا "تم کیا لوگی؟"

اُس نے جواب دیا "جو آپ کی خوشی"۔

مادہابی نے کہا "میں تمکو تین روپیہ اور کھانا دونگی"۔

"میں چاول نہیں کھاؤں گی میم صاحب" لڑکی نے کہا۔

"تو کیا چاہتی ہے پلاؤ؟" مادہابی نے مذاق کے لہجہ میں پوچھا۔

لیکن لڑکی نے بغیر مسکرائے ہوئے کہا "آپ مجھکو چاول دیدیا کیجیگا میں خود پکا لونگی۔ ہم لوگ باورچی کے ہاتھ کا پکا ہوا نہیں کھاتے ہیں"۔

سمارش نے ہنس کر کہا "اوہ! یہ ذات کے بارے میں بڑی کٹر معلوم ہوتی ہے۔ ہم لوگ آریا نسل سے ہونے کے باوجود بھی ایسی سنتھال لڑکی کے لئے کافی نہیں ہیں"۔

"بہت اچھا میں تمکو بغیر پکا ہوا کھانا دوں گی اور تین روپیہ مہینہ" مادہابی نے کہا۔

لڑکی بالکل مطمئن معلوم ہوتی تھی۔ مادہابی نے کہا "میں تم کو اپنا پتہ دونگی اور تمکو وہاں ٹھیک ۶ بجے پہونچ جانا چاہیئے۔ ہاں تمہارا نام کیا ہے؟"

"بھٹکی" لڑکی نے جواب دیا اور مادہابی سے پتہ لیکر چلی گئی۔

مادہابی نے سمارش سے کہا "تم ہمیشہ میرے روپیہ برباد کرنے کی شکایت کرتے ہو۔ اگر اُس نے رہنے کا فیصلہ کر لیا تو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے۔ کلکتہ میں اگر تم ایک آیا رکھنا چاہو تو فوراً

بیس روپیہ مشاہرہ مانگیگی اور کھانا اور رہنے کی جگہ۔ بجائے اس کے اگر کوئی خادمہ تمکو تین روپیہ ماہوار پر ملتی ہے۔ تو یہ فضول خرچی ہے"۔

"تمہاری مرضی جو چاہو کرو۔ میرے پاس جو کچھ تھا وہ سب تمہارا ہو چکا ہے یہانتک کہ میں بھی، کیا میں کچھ اس سے بھی زیادہ دے سکتا تھا؟"

"میں امید کرتی ہوں کہ تم اس کو یاد رکھو گے" ماوہا بی نے کہا "اگر میں پہلے مرجاؤں تو میری ملکیت جاکر کسی دوسری عورت کو نہ دیدینا"۔

جواب میں سمارش صرف ہنسا۔

(۲)

دوسرے دن علی الصباح ٹھیک ۲ بجے بھٹکی اپنے کام پر پہونچ گئی۔ اس کے گلے میں تسبیح والی موتیوں کا چار لڑا مالا تھا اور اُس نے مضحکہ خیز اور تعجب انگیز طریقہ پر بہت سا سرخ فیتہ لپیٹ رکھا تھا۔ ماوہا بی جلدی سے اپنی خمار آلود آنکھوں کو ملتی ہوئی اُٹھی اور اُس نے اپنے شوہر سے کہا "دیکھو وہ کیسی وقت کی پابند ہے گرچہ وہ صرف تین روپیہ مشاہرہ پاتی ہے۔ برعکس اس کے تمہارا بیرا جو بارہ روپیہ پاتا ہے اب تک سو رہا ہے۔ وہ کھوکھا کو صبح کی ہوا خوری کیلئے ۹ بجے سے قبل کبھی نہیں لیجا سکا۔ میں یوں ہی فضول کھوکھا کے لئے آیا نہیں چاہتی تھی۔ یہ نکمے نوکر مجھکو پاگل کئے ہوئے ہیں۔

جیسے ہی بھٹکی اندر داخل ہوئی کھوکھا نے اُسکی طرف تعجب کی نظروں سے دیکھا اور پوچھنے لگا۔ "یہ کون ہے اماں!"

"وہ تمہاری آیا ہے" ماں نے جواب دیا۔

کھوکھا نے ماں کا منھ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور اپنی طرف گھما کر پوچھنے لگا "آیا کیا کریگی؟"

"وہ تمہارے ساتھ کھیلے گی، باہر ٹہلانے کو لیجائے گی اور تمکو اچھے اچھے قصے سنائیگی" کھوکھا خوشی کے مارے اُچھلنے لگا اور ہمہ تن متوجہ ہو کر پوچھنے لگا "کون قصہ وہی بلی اور سیار والا"۔

اُسکی ماں نے تنگ آکر جواب دیا "جاؤ اسی سے پوچھو"۔

کھوکھا پہلے پہل کچھ شرمایا اُس نے اپنی ماں کی ساری کے آخری حصہ کو زور سے پکڑ لیا اور گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ رہ رہ کر بھٹکی کی طرف توہم کی نگاہوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ گرچہ بھٹکی بہت متین معلوم ہوتی تھی لیکن وہ بھی مشکل سے ہنسی کو روک سکی۔ اس نے "آؤ بابو" کہتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو پھیلا دیا۔

یہ ایک پکار، کھوکھا کے دل پر فتح پانیکے لئے کافی تھی وہ اس کے بازوؤں پر اُچھل کر چلا آیا اور چمٹکر کہنے لگا "مجھکو اچھے اچھے قصے سناؤ۔"

(۳)

ٹھبکی اپنے کام کو عبادت کی طرح انجام دیتی تھی، صبح کی تاریکی دور ہونے سے پہلے ہی ٹھبکی کھوکھا کے استعمال کے برتنوں کو اکٹھا کرتی اور اپنی کلائیوں سے چھن چھن کا شور برپا کر دیتی۔ کتنا ہی سویرا کیوں نہ ہو مادہابی اُسکو اپنی خوابگاہ کے دروازہ پر کھوکھا کو لینے کے لئے مستعدی کے ساتھ کھڑا ہوا پاتی تھی۔ اُس کی سخت پابندی کی وجہ سے مادہابی اور سمارش کو مجبوراً معمول سے پہلے اُٹھنا پڑتا تھا۔ سمارش نے پہلے تو اس پر اعتراض کیا مگر وہ مادہابی کا مقابل نہ تھا "نہیں! نہیں!! یہ اچھا نہیں ہے" وہ کہتی "تم گرم کملوں کے نیچے سوتے رہتے ہو، جبکہ اللہ کی ایک مخلوق تمہارے حکم کی تعمیل کے انتظار میں تمہارے دروازہ پر سردی سے ٹھٹھر رہی ہے" تمکو یورشینوں کے بُرے اطوار کی نقل اتارنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان کے کمرہ سے متصل دکھن جانب ایک بڑا برآمدہ تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے باغ کے سارے درختوں کو ہلاتے ہوئے تیر کی طرح کمرہ کے اندر بہتے ہوئے (ٹاٹوں) کے جھبروں کو چھیدتے ہوئے اندر گھس آتے تھے۔ ٹھبکی کے پاس سوتی ساری کے سوا کوئی گرم کپڑا نہ تھا۔ اس لئے سمارش کو اپنا سرخ کمل چھوڑکر اٹھنا پڑتا تھا اگرچہ بہت ہی بیدلی کے ساتھ۔

جیسے ہی وہ اُٹھتا کھوکھا بھی اُچھل کر کھڑا ہو جاتا۔ اُس کے لئے ٹھبکی کی دل موہ لینے والی باتوں کی یاد جادو کی اُس سنہری چھڑی کا کام دیتی تھی جس کے مس کر دینے سے شاہزادی اپنی دائمی نیند سے بیدار ہو گئی تھی۔ وہ بستر پر سیدھا کھڑا ہو جاتا اور اپنے گھونگھر والے بالوں کو اپنے منہ پر سے ہٹاتے ہوئے چلاتا "بابا مجھکو نیچے اتار دو میں ٹھبکی کے پاس جانا چاہتا ہوں۔"

اُسکی ماں کہتی "کیا احسان فراموش لڑکا ہے۔ رات بھر مجھکو دیکھنا پڑتا ہے کہ کمل کو بدن سے علیحدہ نہ کر دے...... میں بہلاتی ہوں، پیار کرتی ہوں، لیکن جیسے ہی صبح ہوتی ہے یہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور چلاتا ہے، میں ٹھبکی کے پاس جانا چاہتا ہوں، جا چلا جا بدمعاش میں تیرے پاس پھر نہیں آؤں گی دیکھیں رات کو تیرے ساتھ کون سوتا ہے۔"

کھوکھا اپنے مچھلی جیسے ہاتھوں کو ہلا ہلا کر کہتا "بہت اچھا ہم ٹھبکی کے ساتھ سوئیں گے۔"

اسکی ماں کہتی "بندر کہیں کا۔"

کھوکھا فوراً بھٹکی کے بازوؤں پر اُچھل کر چلا جاتا اور کہتا "میں آگیا بھٹکی مجھے پیار کرو۔"

بھٹکی چاروں طرف ایک دزدیدہ نگاہ ڈالتی اور کھوکھا کا منھ چومنے لگتی وہ خوفزدہ تھی کہ کہیں مادہابی دیکھ نہ لیں کیونکہ انھوں نے بچہ کا منھ چومنے کی ممانعت کردی تھی کیونکہ یہ حفظان صحت کے اُصول کے خلاف تھا۔

کھوکھا جب ناشتہ کرلیتا تو وہ اور اُسکی کھلائی دونوں باہر چلے جاتے اور باغ میں بڑے نیم کے درخت کے نیچے بیٹھتے۔ بعض مرتبہ مالی، بیرا، اور مہترانی بھی آکر بیٹھتے اور کھوکھا کو پھول اور پھل پیش کرتے۔

بھٹکی ایک بانس کے بنے ہوئے اسٹول پر بیٹھتی آفتاب پوری آب وتاب کے ساتھ اُس کے منھ پر چمکتا اور کھوکھا ایک چھوٹی سی پہیہ والی کرسی پر بیٹھتا۔ اور آفتاب اُس کی پیٹھ پر پڑتا تھا۔ بڑی سردی ہے کھوکھا بابو اور میرے پاس کپڑے نہیں ہیں"

کھوکھا کا دل فوراً رحم کے مارے پگھل جاتا اور اُسکو تسلی دیتے ہوئے کہتا "میں کل تمھارے لئے دوکان سے کپڑے خرید دونگا۔ میں تمہارے لئے ایک نیا کوٹ لا دونگا۔ پھر تم اپنے ہاتھوں کو جیب کے اندر رکھکر سڑک پر ٹہلنا۔ اور اپنے پرانے کپڑے پھینکدینا۔"

بھٹکی پھر پوچھتی "اور کیا لادوگے کھوکھا بابو۔"

"میں تم کو دونگا۔ آلو چاپ ــ نارنگیاں۔ مٹھائی اور سب چیز۔"

چھوٹا سخی داتا جواب دیتا۔

مالی پانی چھڑکنے کا برتن لئے ہوئے آتا اور پوچھتا "مجھکو کیا دیجیگا مالک۔"

کھوکھا کے چہرہ پر متانت آجاتی اور کہتا "ماما تمہارے لئے چیزیں خریدینگی۔"

بیرا پوچھتا "میرے لئے کچھ نہیں کھوکھا بابو۔"

کھوکھا تنگ آجاتا اور چلاتا "جاؤ میں تمہیں نہیں چاہتا۔"

بھٹکی فاتحانہ انداز سے دیکھتی اور بچے کو اپنی آغوش میں کھینچ لیتی۔

(۴)

شام کے وقت کھوکھا ہوا خوری کے لئے قریب کے میدانوں میں گیا تھا۔ مادھابی موسم خزان کے سہ پہر کی مختصر نیند سے بیدار ہوئی اور اُس نے دیکھا کہ کھوکھا اُس کے کمرہ میں نہ تھا لیکن تمام

بکس کھلے ہوئے تھے۔ جب کھوکھا یہاں نہیں ہے تو کس نے ایسا کیا ہوگا؟ وہ باہر آئی اور اُس نے نوکروں سے دریافت کیا لیکن، اُسکو کوئی تشفی بخش جواب نہ مل سکا۔

جاڑے کی مختصر شام جلدی سے ختم ہو گئی۔ راستے اور میدانوں کو نرم اور سرد چھوڑ کر اور درختوں کے سروں سے روشنی کا تاج چھین کر سورج ڈوب رہا تھا۔ مادہابی نے وہاں کے کھیتوں کی طرف نظر کی اور دیکھا کہ راستہ کا کنارہ خیموں سے بھرا ہوا ہے جس کو ایک خانہ بدوش جماعت نے نصب کیا تھا۔ عورتوں نے آگ جلا رکھی تھی اور مٹی کے برتن میں کھانا پکا رہی تھیں۔ مادہابی نے خیال کیا کہ غالباً یہی لوگ آئے ہونگے کہ موقع ملے تو کچھ چرالیں اور خوفزدہ ہو کر چیزوں کو الٹ پلٹ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ وہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ اپنی کسی چیز کو پہچان سکتی ہے یا نہیں۔ کھڑکی کے باہر برابر دیکھتی رہی۔ ٹھکی کا سر جو سرخ فیتوں سے سنوارا ہوا تھا سڑک پر نمودار ہوا۔ لیکن کھوکھا کی گاڑی پر کون بیٹھا ہوا ہے؟ ..... وہ قوس و قزح کے تمام رنگوں کی پوشاک پہنے ہوئے نظر آتا تھا۔ لیکن جب وہ نزدیک پہونچے تو مادہابی صاف دیکھ سکی کہ یہ کھوکھا کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ وہ ایک سرخ مخمل کا پتلون اور ساٹن کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اوس کے اوپر وہ ایک چمکدار گلابی اونی چادر اوڑھے ہوئے تھا اور اُس کے چھوٹے چھوٹے پیر سبز موزوں اور سفید جوتے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ایک ٹوپی جس پر سنہرے کلابتوں کا کام بنا ہوا تھا اُس کے سر پر تھی۔ ٹھکی نے تمام بکسوں کو چھان مارا تھا اور کھوکھا کو پہنانے کیلئے جو چیز اُس کی نظر میں بھڑکیلی معلوم ہوئی اُس نے اُس کو نکال لیا تھا۔ خوبصورت خوبصورت کپڑے جن کو مادہابی نے بڑی جانفشانی سے جمع کیا تھا سارے کے سارے غارت ہو گئے تھے۔ مادہابی غضبناک ہو گئی اور جیسے ہی قصوروار کھانی اندر داخل ہوئی وہ اس پر برس پڑی "بدمعاش! تو نے یہ کیا کیا؟" وہ چلائی "پہنانے کے لئے اس گرم سوٹ پر تیری نظر نہ پڑی"

ٹھکی نے متانت سے جواب دیا "کھوکھا بابو میلے کپڑے نہیں پہننا چاہتے .... مجھکو شرم آتی ہے"

مادہابی نے کہا "اوہو بڑا نواب بنا ہے .... اُسکو میلی چیزوں سے شرم معلوم ہوتی ہے .... چلی جا بدذات .... میرے بچے کو مت چھو"

ٹھکی نے بچے کو رکھ دیا اور کنارے بیٹھ گئی "ٹھکی! ٹھکی!!" چلا کر کھوکھا نے سارے گھر کو سر پر اُٹھا لیا۔ اس پر بھی ٹھکی کو اُس کے قریب آنے کی ہمت نہ پڑی۔ شدت غم سے کھوکھا زمین پر لوٹنے لگا۔

"کیسا سندر ہے"؟ مادہابی نے کہا "اب اس کے ڈر سے ٹھکی کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا ہے۔ اس کو لیجا۔ مگر میرے بکس کو چھونے کی پھر جرات نہ کرنا۔"

ٹھکی نے حسب دستور اپنے متین چہرہ کے ساتھ کھوکھا کو گود میں لے لیا اور باہر چلی گئی۔ جب وہ اتنی دور چلی گئی کہ جہاں سے مادہابی تک اُسکی آواز نہیں پہونچ سکتی تھی تو اُس نے آہستہ سے کان میں کہا "کھوکھا بابو تم بہت امیر ہو۔ جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو منوں سونا اور چاندی پہنو گے۔ تم بادشاہ ہو جاؤ گے۔ بیرسٹر ہو جاؤ گے۔"

"نہ ام۔ نہ ام" کھوکھا نے کہا "میں کھوکھا رہوں گا۔"

جیوں جیوں دن گذرتا گیا مالی روز بروز کھوکھا کی محبت کا زیادہ دلدادہ ہوتا گیا۔ وہ شاید ہی اُس کے نزدیک سے غیر حاضر رہتا۔ صرف ایک نوکر کلکتہ سے ساتھ آیا تھا۔ لیکن وہ بہت سست تھا۔ کلکتہ میں مادہابی کو برآمدہ اور کمروں کو صاف کرنے کے لئے روزانہ ڈانٹ ڈپٹ کی ضرورت پیش آتی تھی لیکن اُس نے محسوس کیا کہ یہاں ایک وسیع باغ کی خبر گیری اُس کے لئے ناممکن ہوگی کیونکہ تنبیہ اور ترغیب دونوں بیکار ثابت ہو چکے تھے۔ اب اُس کو شوہر کے ساتھ ایک جنگ کرنی پڑی کیونکہ وہ ایک مالی رکھنا چاہتی تھی اور حسب معمول آخر کار اُسی کی بات رہی۔

شروع شروع میں مالی بہت کم کام کرتا تھا۔ وہ پودوں اور درختوں میں پانی دیتا اور ڈرائنگ روم کے گلدانوں کو بہت سے پھولوں سے سجاتا۔ کمرہ تازہ پھولوں کی خوشبو سے مہک اُٹھتا اور پرانی دیواروں اور پرانے فرنیچر میں ایسی شان رعنائی پیدا ہو جاتی کہ سمارتش بھی ایک ضرورت سے زیادہ نوکر رکھ لینے کی شکایت کو بھول جاتا۔ لیکن مادہابی اُن نوکروں کو پسند نہیں کرتی تھی جو ہمیشہ اپنے جائز فرائض سے پہلو تہی کرتے تھے۔ مالی گھر کا ایک کام بھی نہیں کرتا تھا اور صاف صاف زور سے کہدیتا تھا کہ وہ باغ کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کیا گیا ہے نہ کہ دوسرے نوکروں کا کام کرنے کے لئے۔

لیکن دفعتاً اُس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اُسکو بہت فرصت ہے۔ اُسکو پرانے نیم کے درخت کے نیچے کھوکھا کے پاس بیٹھے ہوئے یا کھوکھا کو کندھے پر چڑھا کر ادھر اُدھر لئے پھرتے دیکھا جاتا تھا۔ ٹھکی ایک شاہانہ انداز کے ساتھ اُس کے پیچھے پیچھے رہتی اور اُس کے ہاتھوں میں کھوکھا کی ٹوپی یا گرم چادر ہوتی۔ وہ آقا معلوم ہوتی اور اُدھر یا مالی اُس کا خادم معلوم ہوتا۔

مادہابی اس نظارہ کو دیکھ کر بھڑک اُٹھتی "دیکھو اس آدمی کو" وہ کہتی "میں نے اسکو رکھا تھا کہ باغ کے کاموں سے فراغت کر کے کھوکھا کو تھوڑی دیر کے لئے کھلایا کرے۔ لیکن وہ میری کبھی نہیں سنتا۔

پودوں میں پانی دینے اور پھولوں کے چھانٹنے میں معلوم ہوتا ہے جیسے دن بھر کی محنت کی ضرورت ہے۔ لیکن وہ اس سنتھالی لڑکی کے پیچھے پیچھے دن بھر پھرا کرتا ہے۔ میں عنقریب اُس کو ایک دن لات مار کر باہر کر دونگی میں اس قسم کے رابطہ کو برداشت نہیں کر سکتی"۔

"تم بیکار کیوں غصہ ہوتی ہو؟" اُس کا شوہر کہتا "وہ بھی انسان ہیں اور اپنے اندر فطرتی محبت اور دوستی کا جذبہ رکھتے ہیں"۔

"لیکن یہ بالکل انھونی بات ہے"۔ اُسکی بیوی جواب دیتی "وہ لڑکی ایک سنتھال ہے اور مالی اُڑیا ہے۔ ان کی دوستی کا فائدہ ہی کیا ہے؟"

"لیکن تم تو سوشل ریفارم کی بہت بڑی مبلغ تھیں"۔ سمارش نے کہا "اگر وہ غریب اور غیر متمدن ہیں تو یہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ تمہاری ہمدردی سے فائدہ نہ اُٹھائیں"۔

لیکن مادہابی کو یہ امر تسلیم کرنا پڑا کہ مالی نے کام میں نمایاں ترقی کی ہے۔ آج کل کھوکھا کے نہلانے کا پانی لانیکے لئے کسی کو چلانا نہیں پڑتا تھا۔ جیسے ہی ٹھبکی کھوکھا کو نہلانے کے لئے تیار کرتی اودے مالی پانی لے کر فوراً حاضر ہو جاتا۔ اگر مادہابی ٹھبکی کو کچھ لانے کے لئے کہتی، اودے ٹھبکی کے اُٹھنے سے پہلے ہی دوڑ پڑتا جب ٹھبکی کھوکھا کو نیچے اتار دیتی، اودے فوراً اُٹھالیتا۔ کھوکھا بہت ضدی اور ہٹی ہو گیا تھا اور بسا اوقات ٹھبکی بھی تنگ آجاتی۔ مگر اودے کو کبھی جبر نہ ہوتا وہ لڑکی کو مصیبت سے چھڑانے کے لئے اپنی پوری طاقت کے ساتھ چھوٹے ظالم کو بہلانے کی ان تھک کوشش کرتا۔ ٹھبکی کو خوش کرنیکی کوشش کرتے ہوئے اُس نے ایک ایک کرکے سب کو خوش کرنیکی کوشش کی۔

(۵)

ہاٹ کے دنوں میں بسا اوقات ٹھبکی اپنی ضرورت کی چیزیں خریدنے کی غرض سے چند گھنٹوں کی اجازت لیتی۔ اس اثناء میں کھوکھا بے صبری کے ساتھ اس کا انتظار کرتا اور اپنی ماں سے بار بار پوچھتا "اماں ٹھبکی کہاں گئی؟"

ہر ہفتہ قریہ میں بازار لگا کرتا تھا۔ درمیان میں ایک برگد کا درخت تھا جس کے نیچے چھوٹی دکانیں لگائی جاتی تھیں۔ بیچنے والے زمین پر اپنی چٹائیاں بچھاتے تھے جن کے اوپر وہ اپنی چیزیں قرینے سے سجا دیتے تھے۔ چاول، دال، مچھلی، سبزی اور مختلف قسم کی چیزیں وہاں مہیا ہوتی تھیں۔ رنگین ساریاں۔ چھپی ہوئی اور سادی، خوشنما موتیوں کی لڑ، کانچ کی چوڑیاں، بال میں لگانے کے کانٹے اور

کنگھیاں، غرضکہ دیہاتی حسن کی زیبائش کا سب سامان موجود تھا۔ اُودے بادرچیخانہ کے لئے مچھلی اور ترکاری لیکر واپس آرہا تھا۔ ٹھبکی ایک کنگھی، ایک بوتل ریںڈی کا تیل، اور ایک ٹین کی بلی لئے جارہی تھی۔ یکایک ایک عورت اُس کے سامنے نمودار ہوئی۔ وہ ایک سرخ ساری جس کے اوپر بڑے بڑے زرد پھولوں کے بوٹے تھے پہنے ہوئے تھی اور اپنے سر پر کانچ کی چوڑیوں کا ایک ٹوکرا لئے جارہی تھی "چوڑی لوگی؟" اُس نے پوچھا۔

ٹھبکی نے رنگ برنگ کی چوڑیوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور فوراً ہی اپنی آنکھیں پھیر لیں۔ "تم چوڑی کیوں نہیں لیتی ہو؟" عورت نے پوچھا۔

"میرے پاس پیسہ نہیں ہے" ٹھبکی نے کہا۔ اُودے نے ایک شرمیلی مسکراہٹ کیساتھ کہا "چوڑی ضرور لو۔ میں قیمت دیدونگا"

ٹھبکی کے جذبۂ خودداری کو ٹھیس لگی اور وہ آگے چلی گئی۔ "کون مانگتا ہے؟" اُس نے غصہ سے پوچھا "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہارے دو پیسہ کی سنگار کی چیزیں لیکر شاہزادی ہوجاؤں گی؟" وہیں سامنے ایک دوکاندار چاندی کی زنجیریں، کڑے، اور پہونچیاں بیچ رہا تھا۔ اودے دوکان میں داخل ہوا اور اُس نے زنجیر اُٹھالی۔ "یہ لوگی؟" اُس نے پوچھا۔

ٹھبکی اور زیادہ غضبناک ہوگئی "جا! بدمعاش کہیں کا۔" اُس نے کہا "میں تجھ سے تحائف کیوں لینے لگی؟"

اودے نے اُس کے کان میں کچھ آہستہ سے کہا۔ انداز سے معلوم ہوا کہ اس سے ٹھبکی کچھ نرم ہوگئی اور وہ ایک مربیانہ انداز سے مسکرائی۔ اودے نے زنجیر کی قیمت دیدی اور زنجیر اُس کے گلے میں ڈالدی۔

جیسے ہی وہ گھر پہونچے کھوکھا نے ایک طوفان برپا کرڈالا۔ وہ ٹھبکی کی زنجیر مانگتا تھا۔ ٹھبکی اُس کو پہناتے ہوئے شرماتی تھی مگر چھوٹا ظالم اس کے بغیر مانتا نہ تھا۔ آخرکار مادبابی آگئی اور اُس نے پوچھا "یہاں کیا ہو رہا ہے؟ میں نے اس کے قبل زندگی میں کبھی ایسا شور نہیں سنا تھا"

"کھوکھا بابو یہ زنجیر مانگتے ہیں" ٹھبکی نے اپنی شرمائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

"کھوکھا اچھی! اچھی!!" اُس نے کہا "تم ایسی چیزیں کیوں مانگتے ہو؟ تم بہت بیوقوف ہو۔ تم کو ٹھبکی کا زیور نہیں پہننا چاہیئے"

"مہربانی کرکے کھوکھا کے لئے ایک خرید دیجئے میم صاحب" ٹھبکی نے بزدلانہ انداز سے کہا۔

"پاگل ہوئی ہے" مادبابی نے کہا "ایسی چیز و نجے خریدنے کا فائدہ کیا ہے؟"

یکایک اُس نے کچھ محسوس کیا" تو یہ زنجیر کہاں سے لائی ہے؟" اُس نے لڑکی سے دریافت کیا "تجھکو صرف تین روپیہ ملتا ہے۔ تو اسباب زینت کیونکر خرید سکتی ہے؟"

ٹھبکی خاموش رہی" جواب کیوں نہیں دیتی ہے؟" مادہابی نے پوچھا۔

ٹھبکی نے تامل کیا اور پھر بولی" کسی نے مجھکو دیا ہے"

مادہابی کو شک ہوا اور اُس نے جرح کرنا شروع کی" وہ کسی نے کون ہے؟"

"اودے" ٹھبکی نے شرما کر جواب دیا۔

مادہابی غضبناک ہو گئی " تجھکو اودے کی تحفہ کو میرے سامنے اکڑ کر دکھلانے کی کیسے جرات ہوئی؟ وہ تیرا کون ہے؟"

ٹھبکی چپ چاپ کھڑی رہی" تو سیدھے جہنم میں جارہی ہے" مادہابی نے اپنی گرج کو جاری رکھتے ہوئے کہا" تجھکو اُس کے ساتھ اِدھر اُدھر جاتے ہوئے ڈر نہیں معلوم ہوتا ہے؟ وہ تیرے ساتھ کبھی شادی نہیں کرے گا؟"

"ہاں! میم صاحب" ٹھبکی آخرکار خوفزدہ ہو کر بولی" اس نے میرے ساتھ شادی کرنے کا وعدہ کیا ہے"

"وہ کچھ نہیں کرے گا" مادہابی نے کہا" تجھکو ذات کھو جانے کے خوف سے میرے یہاں کا پکا ہوا کھانے میں ڈر معلوم ہوتا ہے..... تو اس اُوڑیا کے ساتھ شادی کرنے پر کیسے راضی ہو سکتی ہے؟"

ٹھبکی کی آنکھیں آنسو سے ڈبڈبا گئیں" میرا کوئی دوست یا رشتہ دار نہیں ہے میم صاحب" اُس نے کہا" اس لئے ذات کا کیا فائدہ ہے؟ اگر وہ میرے ساتھ شادی کرلے گا اور مجھکو اوڑیا بنالے گا تو میں کسی کو اپنا کہہ سکوں گی"

مادہابی کچھ اور زیادہ نہ کہہ سکی۔ ٹھبکی نے کھوکھا کو گود میں لے لیا اور باہر چلی گئی۔ باغ میں کوئی نہ تھا۔ وہ ایک پھول کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی اور اپنی زنجیر اُتار کر اُس نے کھوکھا کے گلے میں ڈالدی۔ کھوکھا نے اپنی باہیں اُس کے گلے میں ڈالدیں اور اُس سے چمٹ گیا۔ ٹھبکی نے کہا" تم بہت اچھے کھوکھا ہو"

(۶)

رات کو مادہابی اور سمارتش میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی" تم نے اپنے مالی کی بیٹی ٹھبکی کی بہادری کے متعلق کچھ سنا؟" مادہابی نے کہا" اس نے ٹھبکی کے لئے ایک چاندی کی زنجیر خریدی ہے اور وہ سب کو دکھلاتی

پھرتی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ لوگ کیا خیال کر رہے ہیں؟"

"شاید سول قانون کے مطابق شادی" اُس کے شوہر نے جواب دیا۔

"بیوقوف مت بنو" مادہابی نے اُس کو آہستہ سے دھکا دیتے ہوئے کہا "تم کو چاہیئے کہ کل اُسکو ڈانٹ دو۔"

دوسرے دن اودے بلایا گیا۔ سمارش نے پوچھا "کیا تم نے کہا ہے کہ تم ٹھبکی سے شادی کرو گے؟"

اودے اس اچانک سوال پر بھونچکا ہو گیا۔ آخر اس نے ہوش و حواس بجا کئے اور گھبرا کر بولا۔

"ایسا کیونکر ہو سکتا ہے حضور؟ اگر میں ایک سنتھال لڑکی کے ساتھ شادی کروں گا تو میری ذات چلی جائے گی۔ پھر یہ کہ میں شادی شدہ ہوں اور میرے گھر پر بال بچے اور سب لوگ ہیں۔"

سمارش نے غصہ ہو کر پوچھا "تب تم نے اُسکو تحفہ کیوں دیا؟"

اودے نہیں جانتا تھا کہ کیا کہے۔ کچھ توقف کے بعد وہ انتہائی حماقت کے ساتھ بولا "حضور میں نے اُسکو کوئی تحفہ نہیں دیا ہے۔ کسی اور نے دیا ہو گا۔"

سمارش نے غصہ میں آکر ایک تھپڑ اُسکو مارا اور بولا کہ "میرے گھر سے ابھی چلا جا۔ میرے منہ پر جھوٹ بولنے کی جرأت کرتا ہے؟ ابھی اسی وقت چلا جا۔"

اودے ایک لمحہ کے اندر غائب ہو گیا۔ یہ دغا دیکھ کر ٹھبکی زمین میں سما جانیکو تیار معلوم ہوتی تھی۔ لیکن وہ اُس کے پیچھے پیچھے جانے سے اپنے کو باز نہ رکھ سکی۔ وہ اُس سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اودے نے غصہ سے پھر کر اُسکی طرف دیکھا اور سخت سخت الفاظ کہے۔

لیکن ٹھبکی کھوکھا کو گود میں لئے ہوئے اب تک اُسکا پیچھا کر رہی تھی۔ مادہابی اپنے کمرہ سے باہر نکل آئی اور ڈانٹ کر بولی "دروازہ سے باہر جانیکی جرأت نہ کرنا ورنہ میں تجھے پولیس کے حوالہ کر دونگی۔"

ٹھبکی واپس چلی آئی "تجھکو شرم نہیں آتی ہے" مادہابی نے پوچھا "اگر اس طرح تو اس کے پیچھے پیچھے دوڑے گی تو تجھکو کسی اچھے گھر میں جگہ نہیں ملے گی۔"

ٹھبکی کھڑی روتی رہی مگر اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے کھوکھا کو ایک لمحہ کے لئے بھی گود سے اتارنے کے لئے انکار کر دیا۔ خود مادہابی بھی کھوکھا کو اُس سے نہ لے سکی۔

شام کو اُس نے کھوکھا کو کھانا کھلایا اور اُسکو سُلا دیا۔ تب اُس نے چپ چاپ اُس کے پھولے پھولے گالوں کا بوسہ لیا اور غم کے آنسو بہاتے ہوئے سرہانے بیٹھ گئی۔

جب مادہابی کمرہ میں داخل ہوئی تو وہ کھڑی ہو گئی اور اُس نے کہا "میم صاحب! مہربانی

فرما کر مجھکو معاف کر دیجیے اور اُس کے علاوہ بھی اگر میں نے کبھی قصور کیے ہیں تو اُن کو بھی مہربانی کر کے معاف کر دیجیے“

(۷)

صبح کو ماد ہابی بہت دیر میں اُٹھی کیونکہ آج برتن مانجنے کی آواز اُس کو بیدار کرنے کے لئے پیدا نہ ہوئی تھی۔ جب صبح کی روشنی کھڑکی کے پردوں سے چھن چھن کر آنے لگی۔ تو ماد ہابی بیدار ہوئی۔ اور فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”ٹھبکی اتنی دیر تک دروازہ پر اس سردی میں کھڑی ٹھٹھر کر رہ گئی ہوگی“ اس نے دل میں کہا۔

اس نے دروازہ کھولا اور یہ معلوم کر کے متعجب ہوئی کہ ٹھبکی وہاں نہ تھی۔ شمال کی سرد ہوا اُجڑے ہوئے باغ میں زور شور کے ساتھ چل رہی تھی۔ اُس نے دوسرے نوکروں کو بلایا مگر ٹھبکی کی کوئی خبر اُن سے نہ ملی۔ وہ پھر اپنے کمرہ میں داخل ہوئی اور بولی ”ٹھبکی وہاں نہیں ہے۔ شاید آتے ہوئے شرماتی ہے“

”کون جانتا ہے“ اُس کے شوہر نے کہا ”کہ وہ بدمعاش اُس کو بہکا کر لے بھاگا ہو“

ماد ہابی کھوکھا کو بستر پر سے لانے کے لئے گئی۔ جیسے ہی اُس نے اُسکو کھینچا اُس نے دیکھا کہ اُس کا ایک سونے کا کڑا غائب ہے ”کس نے اس کا کڑا لیا ہے؟“ وہ چلائی ”اُسی کیتا نے چرا لیا ہوگا۔ اب میں سمجھی کہ وہ کیوں غائب ہے۔ اُس نے زیور لے لیا اور اُس بدمعاش کے ساتھ چلی گئی۔

”یہ بالکل ممکن ہے“ اُس کے شوہر نے کہا ”لیکن اُس نے صرف ایک کڑا کیوں چرایا اور دوسرا کیوں چھوڑ دیا؟ یہ تعجب انگیز امر ہے۔

”اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے“ اُس کی بیوی نے جواب دیا ”وہ دونوں ہی کڑے لینے کو تھی کہ میں اندر آگئی۔ اور اُس کی دیدہ دلیری تو دیکھو کہ مال غنیمت کے ساتھ چلتے وقت اس نے مجھ سے معافی مانگی۔

ماد ہابی نے کھوکھا کو زمین پر اتار دیا اور فوراً ہی ایک جھنجھناہٹ کی آواز آئی اور وہ زنجیر جس کا اتنا چرچا تھا، ٹھبکی کے چند کم قیمت زیورات، اور تین چاندی کے سکے نیچے آگرے“ یہ اور زیادہ تعجب کی بات ہے“ سمارش نے کہا ”اپنی چیز چھوڑ دینا اور دوسروں کی چرا لینا۔ لیکن زنجیر نقلی چاندی کی بنی ہوئی ہے۔ بدمعاش نے اُسکو ہر طرح دھوکا دیا“

”یہ صرف اشک شوئی کے لئے ہے“ اُسکی بیوی نے کہا ”وہ ہم لوگوں کو حیرت میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے اُس نے یہ سب فضول چیزیں چھوڑ دیں۔ لیکن اس مرتبہ میں اس کو آسانی سے بھگا جانے

دونگی ۔ تم کو ضرور تھانہ پر جانا چاہیئے ۔"

سمارش نے چائے پی اور تھانہ کا قصد کرکے روانہ ہوا ۔ سب سے پہلی چیز جو اسکی آنکھوں کے سامنے آئی وہ ٹھبکی کا کالا سر تھا ۔ وہ سر جھکائے ہوئے دروازہ سے لگی ہوئی کھڑی تھی ۔ اس لئے پہلے پہل سمارش پر اُس کی نظر نہ پڑی ۔ اس نے دیکھا کہ لڑکی رو رہی ہے ۔

اُس کو لڑکی کی اس بیکسی پر ترس آگیا ۔ وہ کانسٹبل کے پاس گیا جو دروازہ کے قریب کھڑا تھا اور بولا " تم اس لڑکی کو کہاں سے لائے ہو ؟ کیا کسی نے اُس کے خلاف رپورٹ لکھوائی ہے ؟ اسکو چھوڑ دو ۔"

جب ٹھبکی کی نظر بولنے والے پر پڑی تو وہ دروازہ کے اور آڑ میں آ گئی ۔ "ہم لوگ اسکو یہاں نہیں لائے ہیں حضور ۔" کانسٹبل نے کہا " وہ خود آئی ہے ۔ اور کہتی ہے کہ ایک اودے نامی مالی نے اُسکے آقا کے لڑکے کا طلائی کڑا چوری کر لیا ہے ۔ اسی سلسلہ میں وہ سب انسپکٹر سے ملنا چاہتی ہے ۔"

" ہاں ! یہ ٹھیک ہے " سمارش نے کہا " لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ مالی نے چرایا ہے ؟"

اس مرتبہ ٹھبکی بولی ۔ " ہاں حضور ۔" اُس نے کہا " میں نے کڑا لیا تھا ۔ لیکن میرا منشا چرانے کا نہ تھا ۔ کھوکھا بابو ایک سونے کی زنجیر مانگتے تھے لیکن میم صاحب نے نہیں خریدی ۔ کھوکھا بابو اس کے لئے چیختے اور چلاتے تھے ۔ تب اودے نے کہا کہ وہ ایک چیز کو دو چیز بنانے کا عمل جانتا ہے اور اگر میں اسکو ایک کڑا دیدونگی تو وہ دو کڑے بنا دے گا ۔ مجھے اُس پر پورا یقین نہ آیا تاہم میں نے اسکو ایک کڑا آزمانے کی غرض سے دیدیا ۔ لیکن کل جب وہ چلا گیا تو اُس نے ہر بات سے انکار کر دیا ۔ اُس نے کہا کہ کڑے کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا ۔ میں نہیں جانتی حضور کہ اتنی بڑی حماقت کے بعد کیونکر سر اونچا کروں ۔ اگر پولیس اُسکو نہیں پکڑ سکتی تو میں اُس کی جگہ پر جیل جاؤں گی ۔ میں ذات کھو سکتی ہوں ، حضور مگر میں کوئی پاپ کرنا نہیں چاہتی ۔"

اتنا کہکر وہ پھر رونے لگی ۔ " حضور میں کھوکھا بابو کے بغیر نہیں رہ سکتی ۔" اُس نے کہا " مہربانی کرکے اس مرتبہ مجھکو معاف کر دیجئے ۔"

سمارش نے کھوکھا کو ٹھبکی کے لئے روتے ہوئے سنا اور بولا ۔ " اچھا " جا ! جلدی جا ! کیونکہ دیر ہو رہی ہے ؟"

(شریمتی شانتی دیوی)

شبلی ابراہیمی (ایم ۔ اے)

اقبالنامۂ جہانگیری کا ایک قلمی نسخہ

اور

عہدِ مغلیہ کے ایک ہندو اہلِ قلم کی چشمدید بیانات

زیرِ تبصرہ نسخہ اس وقت میرے سامنے اقبالنامہ جہانگیری کا ایک قلمی نسخہ ہے، اور اسی پر میں تبصرہ کرنا چاہتا ہوں یہ نسخہ ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے، ہر صفحہ میں ۱۳ سطریں ہیں۔ ۲ ذیقعدہ ۱۲۲۱ھ میں اسکی کتابت ہوئی، یعنی آج سے ایک سو ستائیس سال قبل یہ کتاب لکھی گئی، کاتب کا نام رام سکھ پنڈت ہے۔

میں ہندو اہلِ قلم کے ان خدمات کا معترف ہوں جو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنی دوستی کے ثبوت میں فارسی ادب کے متعلق انجام دی ہیں، چنانچہ شاہ عالم ثانی کے زمانہ (۱۲۲۹ھ) میں بھگوان داس نے تذکرۂ شعرا کے متعلق ایک کتاب "سفینۂ ہندی" لکھی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جو آزاد بلگرامی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے پٹنہ لائبریری میں موجود ہے، اسی طرح بندرابن داس نے بھی "سفینۂ خوش گو" کے نام سے فارسی زبان کے اُن شعرا کا تذکرہ لکھا جو اکبر کے بعد ہندوستان میں تھے۔ یہ شخص سراج الدین علی خاں آرزو کا شاگرد تھا اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح محمد حسین آزاد مرحوم نے "آبِ حیات" میں ذوق کے ساتھ اپنی روحانی وابستگی اور عقیدت و نیازکیش کا حال لکھا ہے، اسی طرح اس ہندو ادیب نے بھی اپنے لائق استاد خان آرزو کے ساتھ اپنی شاعرانہ عقیدتمندیوں کا اظہار کیا ہے، چنانچہ خان آرزو کے حالات اگر تفصیل کے ساتھ کہیں ملیں گے تو اسی ہندو شاگرد بندرابن داس کے "سفینۂ خوش گو" میں، مگر ساتھ ہی اس کے اس صف میں بعض وہ حضرات بھی نظر آتے ہیں جو صرف شوق میں علمی کام تو کرنا چاہتے تھے، لیکن علمی بے مائگی کے باعث وہ کوئی قابلِ قدر خدمت انجام نہیں دے سکے۔ چنانچہ اسی صف میں نسخۂ ہذا "اقبالنامۂ جہانگیری" کے کاتب رام سکھ پنڈت بھی ہیں۔

اس میں شک نہیں یہ کتاب خط نستعلیق میں ہے، اور کاتب نے بڑے استقلال کے ساتھ نقل کی ہے، ظاہری نمائش بھی نظر فریب ہے، لیکن جب مینے اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا شروع کیا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ اول سے آخر تک اس میں کتابت کی ایسی فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کاتب فارسی زبان سے بالکل نابلد تھا، اس لئے تبصرہ کرنے سے قبل مجھے بڑی عرق ریزی کے ساتھ کتابت کی غلطیوں کو دور کرنا پڑا۔ جو سخت صبر آزما کام تھا، لیکن تصحیح کرتے وقت میرے پاس کوئی دوسرا نسخہ نہ تھا کہ مقابلہ کرتا اس لئے متن کی صحت میں مجھے اپنی ہی ذات پر اعتماد کرنا پڑا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے اقبالنامہ جہانگیری کا نسخہ بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے،

اصل کتاب

اقبالنامہ کا مصنف معتمد خاں عہد جہانگیری کا ایک درباری اہل قلم تھا، کتاب کے اندر جستہ جستہ اس نے اپنے حالات بھی لکھے ہیں، قدیم مورخین اسلام کی طرح مصنف نے سال کے اعتبار سے اس کتاب کی ترتیب دی ہے، اس میں ابوالمظفر نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ خاندان مغلیہ کے چوتھے فرمانروا کے عہد سلطنت کے حالات سے بحث کی گئی ہے، ابتدا میں ایک مختصر سی تمہید ہے اس کے بعد اول سال جلوس سے لیکر بائیس سال تک کے حالات قلمبند کئے ہیں، یعنی سنہ ۱۰۱۴ھ سے سنہ ۱۰۳۷ھ کے درمیان سلطنت مغلیہ میں جو سیاسی و ملکی واقعات رونما ہوئے اُن کے چشمدید حالات اس کتاب میں ملتے ہیں، اس سلسلہ میں مصنف نے اس عہد کی سیاسیات کے علاوہ بہتیری ایسی باتیں لکھی ہیں جو عام مذاق کے لئے بھی دلچسپ ہیں، مثلاً اس عہد کے علما و فضلا، صوفیہ و درویش، عمارات و آثار آرٹ و صنعت طیور و وحوش، سیر و شکار، نذر و پیشکش، عجائب و غرائب کے متعلق نہایت دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے، اور میں ان تمام عنوانوں پر ایک تفصیلی بحث کرنا چاہتا ہوں،

حالات مصنف

کتاب کا تمام و کمال مطالعہ کرنیکے بعد مصنف کے ذاتی حالات کے متعلق بھی بہت سے واقعات مل جاتے ہیں، چنانچہ یہ شخص اپنی اعلےٰ قابلیت، وفاداری اور اطاعت شعاری کی بدولت "بخشی" کے معزز عہدہ پر پہونچ گیا تھا، جلوس کے چودھویں سال بادشاہ کے سفر کشمیر کے سلسلہ میں اس نے ایک نہایت ہی دلچسپ واقعہ لکھا ہے، اثنائے سفر میں ایک منزل ایسی ملی جسکی راہ بالکل دریا کے کنارہ واقع تھی، اور اُس کے ہر دو جانب بڑے بڑے پہاڑوں کا سلسلہ تھا، یہاں پر بادشاہ نے مصنف کو ٹھیرا دیا، اور کہا کہ میرے چلے جانے کے بعد تمام فوج عقب سے آئے، مصنف نے اپنا خیمہ و خرگاہ پہلے ہی سے روانہ کر دیا تھا، اس لئے اپنے آدمیوں کو پیام بھیجا کہ جس منزل پہ پہونچ چکے ہو وہیں ٹھر جاؤ ادھر بادشاہ چلے رستہ میں زور کا طوفان آیا، بجلی کی چمک، رعد کی گرج، برف و باراں کی صعوبت سے

بادشاہ کی طبیعت سخت پریشان ہوئی، خیمہ و خرگاہ پیچھے تھا، نورجہاں بیگم، خواص، اور خواجہ سرا ساتھ تھے، منصبداروں کو عقب سے آنے کا حکم مل چکا تھا، یکایک مصنف کے آدمی جہاں ٹھہرے تھے، وہ خیمہ نظر آیا، شاہی خاندان نے اسی میں پناہ لی، اس کے بعد بادشاہ نے مصنف کو بلا بھیجا اور تمام نذر و پیشکش جو حضور میں موجود تھا سب اُسے عطا کیا، چنانچہ مصنف لکھتا ہے:-

"آنچہ در بساط بود از نقد و جنس .... بہ تفصیل بہ رسم پیش کش در پائے انداز معروض داشت ہمہ را بایں غلام بخشیدند، و فرمودند کہ متاع دنیا در چشم چہ نماید جواہر اخلاص را بہ بہائے گراں خریدارم الحق این اتفاق از اثر اخلاص و تائیدات طالع اوست کہ مثل من بادشاہے با اہل حرم خود یک شبانہ روز در خانہ او بہ راحت و آسودگی بسر بردہ او را در امثال و اقران و اہل جہاں چنیں روئے سرفرازی شود"

اس کے بعد لکھتا ہے:-

"روز پنجشنبہ در موضع کہانی نزول موکب منصورہ اتفاق افتاد سر پائے کہ پوشیدہ بودند بہ کمترین بندہا مرحمت فرمودند، و منصب ایں فدوی از اصل و اضافہ ہزاروپانصدی ذات و پانصد سوار حکم شد"۔

جلوس کے تیسرے سال مصنف کو "معتمد خاں" کا خطاب ملا، چنانچہ خود لکھتا ہے:-

"در چہارم ربیع الاول راقم اقبالنامہ بہ خطاب "معتمد خانی" ممتاز گشت"۔

جلوس کے نویں سال جب خبر آئی کہ فدائی خان شہزادہ خورم (شاہجہاں) کے بخشی نے انتقال کیا تو یہ خدمت مصنف کو ملی اسی طرح جلوس کے گیارہویں سال مصنف کو "بخشی گیری" کی خدمت، منصب ہزاری اور خلعت اور سلی ملا۔

کشمیر اور اس کے نزہت افزا مناظر کے متعلق روشنی ڈالنے میں مصنف نے جس طرح اپنی لطافت بیان اور نزاکت حس و اثر پذیری کا اظہار کیا ہے قابل تعریف ہے، اسی سلسلہ میں ایک جگہ "کوہ ہارون" کا (جسے اہل ہند "ہری پربت" کہتے ہیں) تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"بر سمت مشرقی آن کوہ دل واقعست ...... حضرت عرش آشیانی (یعنی اکبر) انار اللہ برہانہ حکم فرمودہ اند کہ دریں مقام قلعہ از سنگ و آہک در غایت استحکام بسند و در عہد دولت جہانگیری قریب الاتمام شدہ چنانچہ کوہچہ مذکور درمیان حصار واقعست و دیوار قلعہ بر دور آں گشتہ و کوہ مذکور بہ حصار پیوستہ و عمارات دولت خانہ مشرف بر آب است و در دولت خانہ باغچہ

واقعست بامختصر عمارتے کہ حضرت عرش آشیانی اکثر اوقات در آنجا می نشستہ اند چوں دریں مرتبہ سخت بے طراوت وافسردہ بہ نظر اشرف در آمد بہ راقم اقبالنامہ حکم شد کہ در ترتیب ایں باغچہ وتعمیر منازل آں غایت جد وجہد بہ تقدیم رسانید ودر اندک فرصت بخش اہتمام ایں فدوی رونق تازہ گرفت ودر باغچہ چبوترۂ عالی سی درعہ مربع مشتمل بر سہ طبقہ آراستہ شد وعمارات از سرنو تعمیر فرمودہ نادرہ کار رشک نگارخانہ چین ساخت وایں باغچہ را از سرنو "نور افزا" نام فرمودند"

خلاصہ یہ ہے کہ "ہری پربت" کے پورب طرف ایک چھوٹی سی پہاڑی "کوہ دل" ہے، اکبر نے یہاں پتھر اور چونے کا ایک قلعہ بنانے کا حکم دیا تھا جو جہانگیر کے زمانہ میں ختم ہوا، چنانچہ یہ پہاڑی قلعہ کی دیواروں کے اندر داخل ہوگئی ہے، یہاں بانی پر ایک عمارت بنائی گئی ہے جس میں چھوٹا سا ایک باغ ہے، اور اس میں چھوٹی سی ایک کوٹھی ہے، جہانگیر نے اس سفر میں دیکھا کہ یہ باغ بہت ویران اور بے رونق نظر آتا ہے، اس لئے مصنف کو حکم ملا کہ شروع سے اس باغ کی ترتیب دے، اور اسکی عمارتیں تعمیر کرائے، مصنف نے تھوڑے ہی دنوں میں اس طور سے باغ کو آراستہ کر دیا اور اسکی عمارتیں درست کرائیں کہ نگارخانہ چین کے لئے باعث رشک بن گیا، جہانگیر نے اسکا نام "نور افزا" رکھا۔

جہانگیر اور اسکی سیرت

گیارہویں جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ جمعرات کے دن جہانگیر آگرہ میں تخت پر بیٹھا، اور ۲۸ ماہ صفر ۱۰۳۷ھ اتوار کے دن بوقت چاشت جلوس کے بائیسویں سال دنیا سے رحلت کی، بائیس سال کے اس عرصہ میں سیاسی نقطۂ نظر سے چند انقلابات ضرور ہوئے، مثلاً رانا امر سنگھ کی اطاعت، قلعہ کانگڑہ کی فتح، جو فیروز شاہ اور اکبر کو بھی باوجود سعی نصیب نہ ہوسکی، شاہجہاں کی بغاوت، نورجہاں بیگم کی سیاسی حکمت عملی، فارس کے خاندان صفویہ سے ازدواجی تعلقات، ان میں ہر مسئلہ سیاسی زاویہ نظر سے بہت کچھ اپنے اندر اہمیت رکھتا ہے، لیکن میں یہاں سیاسیات کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہوں، چونکہ عوام کے ذوق جمالیاتی کی نزاکت سیاسیات کے خشک مباحث کی گرانیاں برداشت نہیں کر سکتی۔

جہانگیر فطرت کی طرف سے جمالیات پرستی کا ایک ایسا ارفع ذوق لیکر آیا تھا کہ اس کی کوئی دوسری مثال شاہان مغلیہ کی زندگی میں نہیں ملتی، معتمد خاں نے نورجہاں سے شادی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ سطحی حیثیت رکھتا ہے، میں بھی اس وقت اس افسانہ کہنہ کا اعادہ بہتر نہیں سمجھتا، ہر چند تاریخی اعتبار سے اس افسانہ کے اندر جو ژولیدگی ہے، اسے سلجھانا بھی ارباب نظر کا فرض ہے، بہرحال میں اس وقت اپنے مصنف

اقبالنامہ کے بیانات پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں اس لئے یہی مناسب ہے کہ صرف انھیں کے "خوان یغما" پر لوگوں کو دعوت نشاط دوں۔

جہانگیر کو سیر و شکار سے خاص دلچسپی تھی، چنانچہ سطور ذیل سے پتہ چلے گا، کہ وہ شیر کے شکار کا مہلک حد تک دلدادہ تھا، شکار ماہی، شکار فیل، شکار آہو و طیور ہمیشہ اسکی تفریح کا مشغلہ تھا سیر و سیاحت سے بھی اسے خاص لگاؤ تھا، چنانچہ ہر سال کشمیر جانا اس کا فرض تھا، صوفیہ اور فقرا سے اسی بڑی موانست تھی، خود انکی خانقاہوں اور ان کے معابد میں جاتا، پہروں ان سے باتیں کرتا، علما و فضلا، شعرا و اہل کمال ہمیشہ اس کی زینت دربار تھے، اس نے بہت سی عمارتیں بنوائیں، شکستہ آثار کی مرمت کرائی، اس کے پانچ بیٹے سلطان خسرو، سلطان پرویز، سلطان خورم، سلطان جہاندار، سلطان شہریار اور دو بیٹیاں سلطان نساء بیگم، سلطان بہادر بانو بیگم ہوئیں، خسرو اور پرویز نے جہانگیر کی زندگی ہی میں وفات پائی خسرو کے دو لڑکے ہوئے اور ایک لڑکی، سلطان پرویز کے بھی ایک لڑکا ہوا تھا لیکن اس نے باپ ہی کی زندگی میں انتقال کیا اسکی ایک لڑکی زندہ رہی جو شاہزادہ داراشکوہ کے عقد میں آئی، شاہزادہ خورم کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں، داراشکوہ، شاہ شجاع، اورنگ زیب، مرادبخش پر بانو بیگم، روشن آرا بیگم، جہاندار کے کوئی اولاد نہیں ہوئی شہریار کی نسل سے جسکی شادی نورجہاں کی لڑکی (جو شیر افگن خاں سے ہوئی تھی) سے ہوئی صرف ایک بچی زندہ رہی،

سیر و سیاحت

معتمد خاں نے جہانگیر کے سفر کشمیر کے سلسلہ میں وہاں کے سبزہ زار، چمنستان، اور تختہ گل و لالہ پر بھی دلفریب انداز میں روشنی ڈالی ہے، اور ابتداءً مملکت کشمیر پر جغرافی اور عمرانی حیثیت سے بھی بحث کی ہے، ابوالقاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ کے دسویں مقالہ میں تاریخی واقعات کے ضمن میں ادبی داد سخن سنجی دی ہے، اور دل کھولکر، چنانچہ فیضی اور عرفی کے قصائد بھی درج کئے ہیں، عرفی نے کشمیر کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا جسکے دو بیت یہ ہیں۔

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید	گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید
بنگر کہ ز فیضش چہ بود گوہر یکتا	جائیکہ خزف در رود آنجا گہر آید

اسی طرح فیضی نے بھی کشمیر کی تعریف میں لطیف خیالات کا اظہار کیا ہے، فرماتے ہیں۔

ہزار قافلہ شوق می کند شب گیر	کہ بار عیش کشاید بہ عرصۂ کشمیر
تبارک اللہ ازاں عرصۂ کہ دیدن او	ورق نگار خیال است نقشبند ضمیر
ہوائے او متنوع چہ فکرت نقاش	زمین او متلون چہ صفحۂ تصویر

بہ پیش فیض نسیمش دم مسیح سموم | بہ نزد آب زلالش زلال خضر غدیر
فضول او متشابہ زاعتدال ہوا، | بہم یکے دی دارد بی بہشت وبہمن وتیر
درو بجائے علف زعفران ہمی روید | کہ آب خاک ورا اینچنیں بود تاثیر
بہر طرف روی از بحر فیض مالا مال | ہزار چشمہ جوشندہ چوں دل تحریر

فیضی کے اشعار میں "صور شعریہ" کی خصوصیت پائی جاتی ہے، تاریخ فرشتہ کے اندر اس کی جغرافی حالت کے متعلق مفصلہ ذیل تبصرہ کیا گیا ہے:۔

"ومختصر آنچہ در ظفرنامہ مسطور است اینست کہ کشمیر از مشاہیر امکنہ معمورۂ عالی است وموضع غریب واقع شدہ آں ولایت در وسط اقلیم چہارم است .... وعرصہ آں ولایت طولانی افتادہ زمین کوہ جنوبی بہ جانب دہلی وزمین کوہ شمالی بہ طرف بدخشاں وخراساں وجانب غربیش بہ صوب مواضع است کہ محل اقامت وسکونت اقوام افاغنہ می باشد، وطرف شرقیش منتہی می شود بہ مبادی اراضی تبت وساحت طول آں عرصہ وآنچہ ہموار واقع شدہ از حد شرقی تا جانب غربی قریب چہل فرسخ است وعرض آں از جانب جنوبی تا حد شمالی لبست فرسخ ودر وسط آں دشت ہموار کہ میان کوہسار واقع شدہ ہزار قریہ معمورہ است ومشحون بہ چشمہ ہائے خوشگوار وسبزہ ہائے لطافت آثار واز شواہد جودت آب وہوائے آں دیار است کہ حسن صورت ولطف شمائل خوباں آنجا در السنہ سخنوراں فرس مشہور شدہ (جسکی ایک مثال "سیہ چشمان کشمیری" کی شہرت ہے) ودر کوہ ودشتش انواع درختان میوہ دار است واثمارش بہ غایت خوب وسازگار"۔

اس کے بعد اور بھی مفصل واقعات درج ہیں جنمیں بعض اہم یہ ہیں:۔

"یہاں شہر کے درمیان ایک نہر جاری ہے، جس کا سوت دریائے دجلہ سے ملا ہوا ہی یہاں سے تین رستے نکلے ہیں ایک راہ خراسان کی طرف گئی ہے، اور یہ بہت دشوار ہے، اس طرف سے مال واسباب چارپایہ پر بھی نہیں لیجا سکتے ہیں، بلکہ آدمی مقرر ہیں جو باربرداری کا پیشہ کرتے ہیں، اور مسافروں کو اس منزل تک پہونچا دیتے ہیں۔ جہاں سے چارپایہ اور سواری پر اسباب وسامان رکھکر سفر کیا جا سکے، دوسری راہ ہندوستان کی طرف گئی ہے اور یہ بھی بہت سخت اور دشوار ہے، ایک رستہ تبت کی طرف گیا ہے، جو سابق الذکر دو راہوں سے آسان ہے۔"

یہ تو فرشتہ کی روایت ہے، اقبالنامہ میں بھی اسی قسم کے مجمل و مفصل واقعات درج ہیں، لیکن یہاں مجھے عہد مغلیہ کے ذوق جمالیاتی کو نمایاں کرنا ہے، اس لئے میں یہاں معتمد خان کے ان مباحث کو نظر انداز کر دیتا ہوں، جہانگیر کا جب دل گھبرایا کشمیر پہونچا، اور وہاں کے گل و لالہ، نسرین و نسترن سے جی بہلاتا رہا، قدرتی چشمے عظیم الشان پہاڑوں کے زمردیں دامن، لطیف ہوائیں، گل و لالہ کا تختہ زار، میوہ دار درختوں کی کثرت فطرت کی ایسی فیض بخشیاں نہ تھیں جو انسانی قلب میں ہلچل نہ پیدا کر دیں خصوصیت کے ساتھ جہانگیر جیسے حساس انسان کے قلب میں جو فطرت کے ہر نقش جمیل پر مٹ جانے کے لئے آمادہ رہتا جہانگیر نے شاہزادگی ہی کے زمانہ میں کشمیر کے اندر بعض عمارات و حوض بنوائے اس سے قبل بھی مغلیہ تعمیر کی بنیادیں پڑ چکی تھیں، معتمد خاں نے جہانگیر کے اس باغ، حوض اور عمارت کا نہایت دلچسپ تذکرہ کیا ہے جو دامن کوہ میں واقع ہے، اور وہاں کا قدرتی چشمہ سبزہ زار میدان (جس کا عکس حوض کے اندر پڑتا ہے تو بالکل نئی چیز اور نئی دنیا سامنے آجاتی ہے) مغلیہ فن تعمیر کی آن بان کے ساتھ مل کر صحرا میں ایک ایسا نقش دلفریب پیش کرتا ہے، جسے دیکھنے کے بعد جی چاہتا ہے کہ دیکھتے رہیں، اور عضلات کی بیتابیاں، حسیات کے شرارے اگر منہ سے کوئی صدا نکالنے پر مجبور کرتے ہیں تو وہ صدائے "ہو" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحرائے کشمیر کے نہانخانوں میں بہت سے "دل والوں کی" ہڈیاں دفن ہیں[۵]

علماء و فضلاء

مصنف اقبالنامہ نے کتاب کے آخری صفحہ میں فضلا و شعرائے دربار کی ایک فہرست دی ہے، کتاب کے اندر بھی بعض حضرات کا ذکر ہے، لیکن بالکل مجمل طریقہ سے انہیں چند اکابر کے حالات میں نے تذکرہ و تاریخ کی ان قلمی کتابوں سے مدد لی ہے، جو پٹنہ اور نٹیل لائبریری میں ہیں فضلائے دربار کی حسب ذیل فہرست ہے۔

ملا شکر اللہ، ملا ابو القاسم گیلانی، ملا باقر کشمیری، ملا محمد مقصود علی، قاضی نور اللہ، ملا فاضل کابلی، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی ملا عبد اللطیف سلطانپوری، ملا عبد الرحمٰن .... گجراتی، ملا حسن فزاعی گجراتی، ملا حسین گجراتی، خواجہ عثمان حصاری، ملا محمود گجراتی، حکیم رکنائے کاشی، حکیم مسیح الزماں کاشی، حکیم ابو القاسم

---

[۵] حوض کے متعلق اقبالنامہ کے یہ الفاظ ہیں، "حوض مثمن چہل و دو درعہ در چہل و دو درعہ و عمقش چہار دہ درعہ آبش در عکس سبزہ در یا چین کہ بر کوہ رستہ، زنگاری رنگ می نماید" یہیں دامن پہاڑ میں وہ قدرتی چشمہ ہے جسکے ساتھ دریائے "جہلم" کا علاقہ لگا ہے (جو شہر کشمیر میں جاری ہے، اور جسکے متعلق فرشتہ نے لکھا ہے کہ دریائے دجلہ سے اسکا سوت لگا ہوا ہے) گل جعفری کا تختہ، چنار کے گنجان درخت، دل میں تازگی پیدا کر دیتے ہیں، کشمیر کی یہ مشہور سیرگاہ ہے، جہانگیر یہیں عیش و جشن منانا تھا، اور اسکی یادگاریں ابھی تک ہیں۔

گیلانی ملقب بہ حکیم الملک، حکیم مومنائے شیرازی، حکیم روح اللہ بروجی، حکیم حمید گجراتی، حکیم تقی گیلانی، بابا طالب اصفہانی، ملا خیالی گیلانی، ملا نصر نیشاپوری، ملا محمد صوفی مازندرانی ملک الشعرا طالب آملی، سعیدائے میر معصوم کاشی۔

معتمد خاں نے پانچ نام اور دئے ہیں، لیکن کتاب کی خرابی کے باعث وہ پڑھے نہ جا سکے۔

بابا طالب صفہانی اور حکیم رکنائے کاشی کا مجمل تذکرہ کتاب کے اندر بھی پایا جاتا ہے، چنانچہ مصنف بابا طالب اصفہانی کے متعلق لکھتا ہے،

"بابا طالب اصفہانی در عنفوان شباب بہ لباس تجرد و قلندری از اصفہان برآمدہ بہ سیر سیاحی گذارش کشمیر افتادہ، و از نفاست جا و لطافت آب و ہوا، دل نہاد آں ملک شدہ توطن و تالف اختیار نمودہ، و بعد از فتح کشمیر بہ خدمت عرش آشیانی پیوست و در سلک بندہ ہائے درگاہ منتظم گشت، و در اواخر عہد حضرت شہنشاہی کہ سال عمرش از چند[ا] (غالباً "صد" ہے) گزشتہ بود در گزشت۔

مصنف نے حکیم رکنائے کاشی کا تذکرہ صرف ایک جگہ جہانگیر کی علالت کے سلسلہ میں لکھا ہے، اور بھی صرف یہ کہ بادشاہ بیمار ہوئے، تو حکیم رکنائے کے علاج کرنے پر بھی افاقہ نہ ہوا۔

"شاہجہاں نامہ" میں تفصیل کے ساتھ اور خلاصۃ الافکار ابو طالب صفہانی میں اجمالی طور پر حکیم رکنائے کاشی کا تذکرہ پایا جاتا ہے، خانامہ براؤن نے تاریخ ادب فارسی بہ عہد جدید" میں حکیم رکنائے کے متعلق خیالات کا اظہار کیا ہے، میرزا افضل سرخوش نے "کلمات الشعرا" میں طالب آملی کے ایک عجیب شعر کا تذکرہ کیا ہے، فرشتہ کے اندر محمد قلی قطب شاہ فرمانروائے دکن کے سلسلہ میں میر محمد مومن استرآبادی کے حالات اور کلام کے متعلق کسی قدر تفصیل سے واقعات ملتے ہیں، اگر حکیم مومن شیرازی دوسرے تھے اور میر محمد مومن استرآبادی دوسرے تو ایک ہی زمانہ میں ہندوستان کے اندر گویا مومن تخلص کے دو اہل کمال تھے، ایک دربار مغلیہ میں دوسرا خاندان قطب شاہیہ میں شاہجہاں نامہ میں بھی حکیم مومنائے شیرازی کے حالات درج ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں اگر ان کتابوں سے مدد لیکر ان اکابر علم و ادب کے حالات پر کسی قدر مزید روشنی ڈالی جائے تو دلچسپی سے خالی نہیں۔

[ا] "چند" صحیح نہیں یہ اصل لفظ "صد" کی تحریف معلوم ہوتی ہے، کیونکہ بابا طالب اکبر کے زمانہ میں فتح کشمیر کے بعد مغلیہ دربار سے وابستہ ہوئے اور عہد جہانگیری کے اخیر میں انتقال کیا تو اس عمر والے کو "چند" کیونکر لکھ سکتے ہیں، خاص کر اس حالت میں جبکہ فتح کشمیر کے قبل بہت دنوں پہلے سے وہاں لگئے تھے۔

مزید روشنی ڈالی جائے، تو دلچسپی سے خالی نہیں۔

میرزا افضل سرخوش طالب آملی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"برائے ایں مصراع شش ماہ فکر کردہ پیش مصرعہ رسانید"[۵۱]

ز غارت چمنت بر بہار منتہا است — کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر باشد

طالب آملی نے جس نزاکت تخیل سے کام لیکر کسی کے اعجاز گلگشت کا تذکرہ کیا ہے، وہ انھیں کا حصہ تھا معلوم ہوتا ہے شاعر کا تصور اسوقت سدرہ نشین تھا، یا وہ خود دنیائے روح وجمال میں مدہوش فصل بہار پر احسان رکھنا اور وہ بھی چمن کو غارت کر کے نیا انداز بیان ہے، شاعر موصوف نے اسکی توجیہ بھی کردی ہے، کہ یہ احسان صرف خیالی بات نہیں بلکہ واقعہ ہے، چونکہ شاخ کے اندر پھولوں میں وہ شگفتگی نہیں رہتی، جو کسی کے کف دست رنگیں میں انھیں شادابی میسر آجاتی ہے، یعنی محبوب کے ہاتھوں میں پھول شاخ کی بہ نسبت زیادہ شگفتہ اور شاداب نظر آتے ہیں یہ ہے رفعت خیال اور نزاکت حسن، اقبالنامہ کی روایت کے مطابق طالب آملی کو جہانگیر نے جلوس کی تیرھویں سال "ملک الشعراء" کا خطاب دیا ہے، معتمد خاں نے بھی مرقومہ بالا شعر نقل کیا ہے

حکیم رکنائے کے والد کا نام حکیم نظام الدین احمد کاشی تھا، کاشان میں پیدا ہوئے، علم طب میں کمال رکھتے تھے، لعض معقول علاج کے صلہ میں دربار صفیہ میں گورہوا، عزت و آبرو حاصل الکین صاحب شاہجہاں نامہ لکھتے ہیں:۔

"لیکن از خوئے ناہموار وسلوک بے ہنجار خود، در آنجا نتوانست ماند، ناگزیر بہ ہندستان آمدہ بدرگاہ گیتی پناہ حضرت عرش آشیانی داکبر) رسیدہ دولت ملازمت اندوخت و چوں روزگار بہ ایں دولت بے اندازہ نشو و نمائے تازہ یافت چندے در زمرۂ آستاں معلے بود، و از ضعف پیری رخصت انصراف وطن حاصل نمود، و از ابر جود خدیو زمان خداوند جہاں گشت امید خویش سر سبز گردانیدہ روزانہ گشت، و بہ عراق رفتہ پس از چندے بہ حرمین شریفین شتافت و لعد از احراز ایں سعادت بدانجا معاودت نمود"[۵۲]

بادشاہ کی تعریف اور ثنا طرازی کے صلہ میں حکیم صاحب کو وطن میں بھی شاہی وظیفہ ملتا رہا حکیم رکنائے صرف طب ہی میں یگانۂ روزگار نہ تھے بلکہ حکیم شفائی کی طرح (جنکی شبیہ براؤن نے تاریخ ادب فارسی بہ عہد جدید میں شائع کی ہے) شعر و سخن میں بھی شہرۂ آفاق تھے، چنانچہ مصنف شاہجہاں نامہ لکھتا ہے:۔

"واز سخنوراں ایران است و اشعارش مقبول ہمگناں۔

(باقی) عبدالمالک آروی

---

[۵۱] کلمات شعرا مصنفہ میرزا افضل سرخوش (قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری)

[۵۲] شاہجہاں نامہ (قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری)

جنت کی حقیقت

یا افسانۂ فردا

دن بھر ریل میں دو رویہ پہاڑوں کی گرم ہوا سے جھلستے رہنے کے بعد دفعتہً شام کو، بنگلور کی سرور بخش و جانفزا ہوا میں پہونچ جانا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خدا نے سارے گناہ معاف کرکے یکایک دوزخ سے بہشت میں پہونچا دیا ہے، وہی سرد و سرد ہوائیں، وہی کھلی ہوئی صاف فضا، وہی جذبۂ سرور و نشاط جسے جوانی کی دولت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آنکھیں حور کو ڈھونڈھ رہی تھیں سو کپن ہوٹل میں وہ بھی میسر آگئی کس منھ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا۔ فرق یہ تھا کہ جنت میں حور غالباً طوبےٰ کے نیچے، یا کوثر و سلسبیل کے کنارے چادر میں لپٹی ہوئی ملتی ہوگی۔ اور یہاں کھانے کے کمرہ میں نظر آئی۔ اور وہ بھی ۲/۳ بالکل عریاں باقی ۱/۳ حصہ کو آپ مستور کہہ لیجئے، لیکن باریک ہلکے ریشم کا حجاب ہی کیا اور وہ بھی بجلی کی روشنی میں کہ اگر انسان ذرا جرأت سے کام لے تو شعاعوں سے پہلے ہی نگاہ شوق کا تمام نشیب و فراز طے کرکے کہیں نہ کہیں اودی اودی رگوں کے جال میں اُلجھ جانا مشکل نہیں۔ ایک یورپین ہوٹل میں مشرقی شیروانی اور ترکی ٹوپی، روز میسر آنیوالی چیز نہیں کہ میں آماجگاہ نظر نہ بنتا۔ اس حور نے مجھے غور سے دیکھا اور مجھ غیر مستحق و مکروہ صورت جنتی نے اس کو۔ اس آدھ گھنٹے کے دوران میں کتنی مرتبہ نگاہوں کا تصادم ہوا اور ہر بار نگاہیں مل کر کس طرح پلٹیں، اس کا ذکر فضول ہے کیونکہ جب صبح کو طعام چاشت کے وقت پھر یکجائی ہوئی تو

التفات اُسکی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

رات کے کھانیکے بعد جب میں لیٹا تو لکھنؤ سے لیکر حیدرآباد تک کی بیسیوں اُلجھنیں سامنے آئیں، لیکن میں نے کوشش کرکے تمام افکار کو دور کیا اور خیال کی تمام خلوتوں کو اسی سیاہ چشم و سیمبر حور کے لئے وقف کرکے غافل ہوگیا۔ سو گیا۔ میں نے اس لئے نہیں کہا کہ اسکے بعد جو کچھ میں نے دیکھا وہ خواب کی نیم شعوری کیفیت سے زیادہ کسی اور کیفیت سے متعلق تھا۔ جسے ہوش و بیداری کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ غفلت ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

—— میں بیخبر سو رہا تھا کہ کسی نے میرا شانہ ہلایا اور کہا کہ "چلو تمہیں جنت میں لیجانیکا حکم ہوا ہے"

ہر چند یہ خبر اس قدر عجیب و غریب تھی کہ مجھے گھبرا کر بغیر کسی خیال خودداری کے دفعتہً اس کے ساتھ چلا جانا

چاہیئے تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اول تو مجھے نیند سے اُٹھایا جانا ہی میرے لئے باعث تنغض تھا۔ دوسرے جگانیوالے کی بد تہذیبی پر بھی مجھے غصہ آرہا تھا کہ کیا اہل جنت کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا جاتا ہے کہ گنواروں کی طرح آکر انھیں جھنجوڑ ڈالا جائے۔ چاہیئے تھا کہ ایک حور آکر آہستہ آہستہ شانہ دابتی، دوسری حور نرمی سے تلوے سہلاتی اور اس پر بھی اگر میری آنکھ نہ کھلتی تو کونے میں بیٹھ کر کوئی ساز چھیڑتی، اپنے لبوں سے میری پیشانی کو مس کرتی اور پھر جب میں انگڑائی لیکر اُٹھنے والا ہوتا تو کم از کم کچھ سہارا ہی دیتی اگر آغوش میں آتے شرم آتی تھی — میں نے جھنجھلا کر پوچھا "آپ کون ہیں"، اس نے جواب دیا کہ:- "میں اعلےٰ علیین کا فرشتہ ہوں اور جنت میں تمہارے ساتھ رہنے کے لئے مامور ہوا ہوں" —— میں یہ سُن کر ہنس پڑا کہ جب اعلےٰ علیین کے فرشتہ کی تہذیب کا یہ حال ہے تو معلوم نہیں کمتر درجہ کی جنتوں میں فرشتوں کی شائستگی کا کیا حال ہوگا اور غریب اہل جنت پر ان کے اکھڑپن سے کیا کیا نہ گزرجاتی ہوگی۔ اس کے بعد پھر مجھے غصہ آیا اور میں نے کہا کہ:- "جنت میں کس ملک کی تہذیب رائج ہے کہ میں تو مخاطبہ لفظ آپ سے کرتا ہوں اور اس کا جواب تم سے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ایک خادم ہونیکی حیثیت سے تمہارا فرض ہے کہ حضور و سرکار کے الفاظ سے خطاب کرو۔ علاوہ اس کے تم کو مطلق خیال نہ آیا کہ اس طرح گنوارپن سے شانہ ہلا ہلا کر بیدار کرنا کس قدر تکلیف دہ۔ اور ایک شائستہ انسان کے لئے کس درجہ ناقابل برداشت ہے۔ اور ہاں یہ کیا کہا کہ تم میرے ساتھ رہنے کے لئے مامور ہوئے ہو۔ تو یہ فرمایئے کہ آپ کا عذاب جنت میں بھی میرے سر پہ مسلط رہیگا۔ مہربانی فرماکر آپ تشریف لیجایئے، اور اپنے داروغہ (رضوان) سے کہئے کہ از راہ عنایت کوئی انسان فرشتہ مامور کریں، اگر مجھے جنت میں بلانا مقصود ہے، ورنہ میں آپ کی اعلےٰ علیین سے باز آیا۔ اور یوں بھی میں سمجھتا ہوں کہ تم غلطی سے میرے پاس آگئے ہو۔ کیونکہ الحمدللہ آج تک میں کسی ایسی غلطی کا مرتکب نہیں ہوا کہ مجھے فردوس میں کوئی جگہ دیجائے۔ اور اگر سہواً کوئی بات ایسی ہوگئی ہے تو اس کا صلہ، صلہ کی طرح ملنا چاہیئے۔ نہ کہ تم ایسے مستقل عذاب کی صورت میں۔" یہ کہکر میں کروٹ لینا ہی چاہتا تھا کہ اس نے دوبارہ زیادہ قوت کے ساتھ میرے شانہ کو پکڑ کر جنبش دی اور میں فرط تکلیف سے پھر اُٹھ بیٹھا

اس کا عجیب عالم تھا، نتھنے پھولے ہوئے تھے، آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں، اور شانوں کے دونوں پر کبھی سمٹتے تھے اور کبھی پھیل جاتے تھے۔ تھوڑی دیر تک اسی خونخوارانہ طریقے سے وہ مجھے دیکھتا رہا اور پھر بولا کہ:- مجھے کتنا افسوس ہے اُن فرشتوں پر جنھوں نے آدم کو سجدہ کرکے حقیر انسان کی اطاعت قبول کرلی۔ کاشکے میں نافرمان ابلیس ہوتا، اس کی ذریات میں سے ہوتا کہ آج تجھ ایسے دوزخ میں جھونکدئے جانے کی قابل ہستی کے پاس آکر اپنی توہین ہوتے ہوئے نہ دیکھتا تم کو جلنا

پڑے گا۔ خوشی سے نہ جاؤ گے تو میں زبردستی گھسیٹ کر لیجاؤں گا۔" مجھے اس فقرہ پر ہنسی آگئی کہ واہ رے اللہ میاں مجھے جنت بھی دی تو اس ٹھکا فضیحتی کے ساتھ، اب میری کیفیت بالکل بدلگئی تھی اور بجائے غصہ کے اب مجھ میں کھلنڈرا پن پیدا ہو چلا تھا۔ میں ہنستا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور بے تکلفی سے اس کے سینہ پر ہاتھ مار کر بولا کہ:۔ "واقعی تم خفا ہوگئے، جنت سے بھلا کوئی انکار کر سکتا ہے، میں تو دیکھ رہا تھا کہ کہیں تم مذاق تو نہیں کر رہے۔" یہ کہکر میں نے اس کے پروں کو چھوا اور بولا کہ:۔ "یار تمہارے پر تو بڑے اچھے ہیں، لیکن شترمرغ کی طرح چھوٹے بہت ہیں، اُن سے تم اُڑتے کیسے ہوگے۔" یہ فرشتہ چاہے کتنا ہی غیر مہذب رہا ہو، لیکن تھا نیک، میری باتوں میں آگیا اور کہنے لگا کہ:۔ "ان پروں کو میں بہت پھیلا سکتا ہوں۔" یہ کہکر جو اس نے ایک گہری سانس اندر کی طرف لی تو دونوں پر پھیل کر تمام کمرے پر چھاگئے وہ بولا کہ:۔ "اگر کہو تو ان دیواروں کو توڑ کر یہاں تک پھیلادوں کہ ایک طرف مشرق کو چھولوں اور دوسری طرف مغرب کو۔" میں نے کہا:۔ "جی نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کیوں مشرق و مغرب کو تکلیف دیں، اپنے پر سمیٹ لیجئے۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ آپ کھاتے کیا ہیں؟" یہ سُن کر وہ اس قدر زور سے ہنسا کہ اُسکے سارے دانت نمودار ہوگئے اور بولا کہ:۔ "ہم کو کھانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا کہ:۔ "پھر یہ آپ کے منھ میں جو پوری بتیسی جڑی ہوئی ہے اس سے کیا فائدہ؟" وہ بولا:۔ "بتیسی کہاں ہے۔" یہ کہکر جو اُسنے منھ کھولا تو واقعی کسی دانت کا پتہ نہ تھا اور اس کا منھ ایک تاریک غار کی طرح کھلا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کو اپنے جسم کی تمام چیزوں پر اختیار حاصل تھا، جب جی چاہے غائب کردے اور جب جی میں آئے انھیں پھر لے آئے۔ میں دیر تک اُس کی ناک، کان، آنکھ کا اسی طرح جائزہ لیتا رہا اور وہ طرح طرح سے اپنے کمالات دکھاتا رہا۔ جب وہ یہ تمام تماشہ دکھا چکا تو میں نے کہا کہ:۔ "برا نہ مانو تو ایک بات کہوں اور وہ یہ کہ بھئی، تم لاکھ فرشتے سہی، لیکن انسان پھر بھی انسان ہے اور بعض باتیں جو وہ کر سکتا ہے تم سے شاید ممکن نہ ہوں۔" وہ یہ سُن کر ہنسا اور بولا کہ:۔ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ انسان بیچارہ میں کیا قدرت ہے، وہ تو بالکل مجبور پیدا ہوا ہے۔" میں نے کہا:۔ "اگر یہ سچ ہے تو میں تمہارا امتحان لوں؟" اسنے جواب دیا:۔ "ضرور۔" میں نے کہا کہ "اچھا اگر یہ صحیح ہے تو ایک ٹانگ اُٹھا کر تھوڑی دور لنگڑی تو چلو۔" افسوس ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوا اور پہلے ہی قدم پر منھ کے بل آرہا۔ میں نے کہا کہ:۔ "اسے جانیدو اچھا اب سامنے کھڑے ہو کر لکھنؤ والوں کی طرح سلام کرو۔" لیکن غریب اس میں بھی کامیاب نہ ہوا اور بہت کوشش کرنے پر بھی وہ حیدرآبادی سلام سے زیادہ ترقی نہ کر سکا۔ میں نے کہا:۔ "خیر ان فضول کو چھوڑو، صبح کا وقت ہے، بھیروں کی کوئی چیز سناؤ۔" اُس نے کہا:۔ "بھیروں کیا ہے میں نہیں جانتا۔"

میں نے کہا کہ:- "سیٹی تو ضرور بجا لیتے ہوگے کچھ اسی میں الاپو" لیکن وہ بیچارہ یہ بھی نہ کرسکا۔ ان لغویات میں جب زیادہ دیر ہوگئی اور اس نے پھر تقاضہ کیا تو میں اُس لنگڑی نہ چل سکنے والے، اہل لکھنؤ کی طرح سلام نہ کرسکنے والے، بھیرویں اور سیٹی سے ناواقف فرشتہ کے پروں پر سوار ہو کر چشم زدن میں بہت بلند ہوگیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ اگر کہیں خدانخواستہ اس نے اپنے پروں کو ذرا بھی سمیٹا تو زمین پر پہونچنے سے پہلے ہی دم نکل جائے گا۔ اس لئے میں نے چاہا کہ اُسے باتوں میں لگائے رہوں اور آخرکار بہت سوچ سمجھ کر میں نے کہا کہ:- "میاں فرشتے، تم غزل بھی کہہ سکتے ہو؟" میں نے یہ اس خیال سے کہا تھا کہ وہ فکر سخن میں محو ہو کر یکساں طور پر اڑتا چلا جائے گا، لیکن یہ سنتے ہی معلوم نہیں غصہ سے یا کیا، اُس نے اپنے پر دفعتًا اس طرح سمیٹ لئے کہ اگر گھبرا کر میں اُس کے گلے میں باہیں نہ ڈالدیتا تو بس چل ہی دیا تھا۔ مجھ پر اس واقعہ سے بدحواسی کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور میں اس وقت ہوش میں آیا جب اُس نے فردوس بریں کے ایک باغ میں لیجا کر مجھے اتارا۔ شکر ہے کہ میرا امین فرشتہ اس وقت موجود نہ تھا اور میں آزادی کے ساتھ چل پھر سکتا تھا۔

فردوس۔ جنات عدن۔ بہشت وغیرہ کے باغوں کے متعلق مولویوں کی زبانی میں سنتا آیا تھا کہ وہاں میوے ہی میوے ہیں اور میوے بھی صرف انگور، انار، اور سیب۔ یعنی اگست ستمبر میں جو حالت کشمیر کی ہوتی ہے وہی فردوس کے باغوں کی بتائی گئی تھی، مئی جون میں شگوفہ و بہار کا جو موسم کشمیر میں ہوتا ہے اس کا تعلق آسمانی فردوس سے کوئی نہیں۔ گویا کہ انسان صرف پیٹ کا کتا ہے جو صرف غذا کی لالچ سے اچھے کام کرسکتا ہے اور معدے کو پُر کرتے رہنے کے علاوہ کسی اور چیز سے دلچسپی ہو ہی نہیں سکتی، یہاں تک کہ اگر کسی باغ میں بھی وہ جائے گا تو اُسے نہ پھولوں سے کوئی واسطہ ہوگا، نہ سبزہ سے، نہ گلبن پر جھومنے والی کلیاں اس کے لئے باعث توجہ ہوسکتی ہیں، نہ وہاں کی عطر آمیز ہوا۔ وہ صرف یہ دیکھے گا کہ کھانے کی کیا کیا چیزیں یہاں موجود ہیں اور کس حد تک وہ لذت کام و دہن کی تسکین میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ احسن التفاسیر میں میں نے ایک روایت دیکھی تھی کہ جنت میں ایک ایک خوشہ انگور کا اتنا بڑا ہوگا کہ اگر کوا ستر ہزار سال تک اڑتا چلا جائے تو بھی اس کو عبور نہ کرسکے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ اگر ساری فردوس میں صرف ۱۰۰ درخت انگور کے فرض کئے جائیں، اور ہر درخت میں کم از کم پانچ خوشے تو ساری کائنات اُنھیں سے معمور ہو جائے گی۔ دوسرے پھلوں کی گنجائش کہاں سے نکلیگی جب کہ انگور کی نسبت سے سیب اور انار وغیرہ کو اور زیادہ بڑا ہونا چاہئے۔ اُسی کے ساتھ میں یہ بھی غور کرتا تھا کہ ان خوشوں کا انگور حجم و وزن میں کتنا بڑا ہوگا اور پھر یہ کہ آخر اہل جنت اسکو کھائیں گے کس منھ سے اور رکھیں گے کس پیٹ میں۔ اس لئے یہاں پہونچنے کے بعد سب سے پہلے مجھے خوشۂ انگور دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ جنتی جس میوہ کی خواہش کرے وہ فورًا سامنے آجاتا ہے، اسلئے

اس خواہش کے پیدا ہوتے ہی سامنے انگور کا ایک خوشہ نظر آیا، جو احسن التفاسیر کے بیان کے مطابق اتنا بڑا تو نہ تھا کہ کوا ستر ہزار برس تک اس کی انتہا کو نہ پا سکے، لیکن ہاں اس کا ایک ایک دانہ ہمالیہ کی بڑی چٹان ضرور معلوم ہوتا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت ایک اور جنتی دوسری طرف سے آتے ہوئے نظر آئے نہایت مقطع بزرگ تھے اور غالباً احسن التفاسیر کے مولف ہی ہوں گے۔ انھوں نے پہلے اس خوشہ کو دیکھا اور پھر میری طرف، مدعا یہ کہ اگر اجازت ہو تو آپ کے حصہ کا یہ خوشہ میں کھا لوں۔ میں نے بڑھ کر اُن کی تواضع کی، اور انھوں نے وہیں سے کھڑے کھڑے جو منھ کھولنا شروع کیا تو وہ اتنا پھیل گیا کہ دو دو دانے یک وقت اس میں سمانے لگے۔ ان کا پیٹ برابر بڑھتا جا رہا تھا اور وہ بغیر کسی فکر و تردد کے دانہ پر دانہ نگلتے جا رہے تھے یہاں تک کہ جب اس غبارہ میں ہوا بھرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تو وہ دفعتاً پھٹا اور تمام دانے ایک ایک کر کے پھر خوشہ میں جا کر لگ گئے، لیکن وہ اب پھولے ہوئے شاداب نہ تھے، بلکہ انکی حالت ایسی تھی جیسے خون پینے کے بعد جونک کو نچوڑ دیا جائے۔ اس واقعہ سے مجھ پر یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ ان کے کھانے اور ہضم کرنے کا کیا دستور ہے۔ اس کے بعد میں نے سیب و انار کی خواہش نہیں کی، کیونکہ وہ مجھے زیادہ مرغوب نہیں، البتہ لکھنؤ کا خربزہ، ملیح آباد کے دسہری آم، کشمیر کا آلوچہ، کابل کا سردہ، اور بمبئی کے انجیر کو ضرور جی چاہا، لیکن یہ کوئی چیز میسر نہ آئی، شاید یہاں کی زمین ان پھلوں کی پیداوار کے لئے مناسب نہیں۔ افسوس ہے کہ پھلوں کی طرف سے فردوس میں مجھے سخت مایوسی سے سامنا ہوا، اور میرے ذوق کا ایک پھل بھی یہاں نہ مل سکا۔

اس کے بعد گھومتا پھرتا میں حوض کوثر کے پاس پہونچا۔ اس میں شک نہیں کہ حوض بہت بڑا ہے، لیکن چونکہ شہد و دودھ کو ملا کر لبریز کیا گیا ہے اسلئے چاروں طرف چپچپاہٹ بہت ہے۔ جنتی لوگ حریصانہ جا کر اس میں غوطہ لگاتے ہیں اور پھر ٹپکاتے ہوئے واپس آتے ہیں، جس سے حوض کے اطراف آلودہ ہو گئے ہیں اور خاص قسم کا لیس اور لبلباہٹ پیدا ہو گئی ہے، چونکہ شہد اور دودھ دونوں بالطبع مجھے مرغوب نہیں، اس لئے میں نے اسکی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ آگے بڑھ کر مجھے سلسبیل و تسنیم نظر پڑیں یہ دونوں فردوس کی ندیاں ہیں، لیکن بجائے صاف اور سرد پانی کے ان میں بھی وہی شہد اور دودھ بہہ رہا ہے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کا سوت حوض کوثر ہی کے سوت سے ملا ہوا ہے۔

آگے بڑھ کر طوبےٰ کا درخت نظر آیا جس پر سینکڑوں چڑیاں سبز رنگ کی بیٹھی ہوئی چہچہا رہی تھیں۔ یہ منظر اچھا تھا، لیکن بغیر بندوق کے کیا خاک لطف آتا، خاموش تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا اور پھر میں نے ایک ڈھیلا زور سے پھینکا کہ شاید کوئی چڑیا اسی طرح گر جائے اور میں اُسے نمک مرچ کے ساتھ

بھون کر دودھ اور شہد کی منغض کرنیوالی کیفیت کو دور کرسکوں، لیکن اس میں کامیاب نہ ہوا، وہ برابر اسی طرح بیٹھی رہیں اور میں مایوس ہوکر آگے چلدیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اہل فردوس کے محلات وقصور شروع ہوئے میں بیتاب ہوگیا۔ کیونکہ اگر مینے کبھی کوئی نماز پڑھی تھی تو صرف اس لالچ سے کہ یہاں، حوریں ملینگی جو دوشیزہ ہیں، سیاہ چشم ہیں، حسین وجمیل ہیں، قاصرات الطرف ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے مینے جلدی جلدی قدم اُٹھائے اور فرط بیتابی میں صدر دروازہ تک پہونچتے پہونچتے دوڑنے لگا۔ سامنے رضواں کھڑے ہوئے تھے اور دورویہ فرشتوں کی صفیں قائم تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی رضواں نے سلام کیا اور ایک تختی مجھے دی جسپر قصر نمبر ۲۴۶۷۵ درج تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اس نمبر کے قصر پر مجھے وہ سب کچھ ملے گا جو فردوس کی انتہائی لذت وسرشاری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میں اپنے قصر کا یہ نمبر دیکھکر ذرا متامل ہوا اور سوچنے لگا کہ جب مجھ سے پہلے ۲۴ ہزار سے زیادہ حوریں چھٹ چکی ہیں تو مجھے کیا خاک ملیگا، لیکن پھر اس خیال سے کہ ممکن ہے سب حوریں ایک ہی طرح کی دوشیزگی وجوانی رکھتی ہوں، تختی لیکر دروازہ میں داخل ہوا، لیکن حالت یہ تھی کہ ریشہ ریشہ شوق کے فراوانی سے کانپ رہا تھا اور دل اس طرح بیتاب تھا گویا منھ کو آیا جاتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ سب سے پہلے پیغمبروں کے نشاط خانے ملیں گے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ یہاں ایک بھی کسی پیغمبر کا قصر نہ تھا اور سب سے پہلا قصر حدیث کے اس راوی کا تھا جس نے سب سے پہلے حور کو ایک حسین عورت کے مفہوم میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ میں نے پوچھا بھی کہ کیا پیغمبروں کی جنت کوئی اور ہے، لیکن اسکا جواب مجھے کسی نے نہیں دیا۔ آگے بڑھا تو اور راویوں کے محلات ملے۔ اس کے بعد جو مولاناؤں اور مولویوں کے قصر ملنے شروع ہوئے تو کسی طرح ختم ہی نہ ہوتے تھے۔ یہانتک کہ میں چلتے چلتے تھک گیا اور گھبرا کر ایک قصر کے اندر السلام علیکم کہکے داخل ہی ہوگیا۔ مولانا تخت پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے آبخورہ پر آبخورہ دودھ اور شہد کا خالی کرتے جاتے تھے۔ جب ایک آبخورہ خالی ہوتا تھا تو غلمان دوڑ کر دوسرا بھرا ہوا آبخورہ رکھدیتے تھے اور مولانا دونوں ہاتھوں سے اس طرح جلدی جلدی اپنے منھ میں اُنڈیل رہے تھے کہ دوڑتے دوڑتے غریب غلمانوں کی بری حالت ہوگئی تھی۔ میں نے بڑھ کر عرض کیا کہ"۔ مولانا سلام کا جواب تو دیجئے، یہ کیا بدمستی ہے، ذرا اپنے تخت کو تو دیکھئے کیسا چپ چپ کر رہا ہے، ذرا اس کو پانی سے دھلوا دیجئے، میں بیٹھکر کچھ دیر آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں"۔ انھوں نے یہ سن کر مجھے گھورا اور پھر بائیں کی قابوں سے جن میں سیب کے بہت سے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے ایک مٹھی بھر کر منھ میں ڈالی اور پھر ایک لمبی اور گہری ڈکار لیتے ہوئے جیسے ہاتھی سونڈ سے منھ میں پانی انڈیل رہا ہو بولے کہ "تم کون ہو اور یہاں کیسے آگئے" مینے عرض کیا کہ "بندہ پرور میں بھی اسی جنت کا گنہگار ہوں، جہاں آپ رونق افروز ہیں، لیکن خدا کے لئے یہ تو بتایئے

کہ اگر کسی کو دودھ شہد، انگور، سیب انار سے رغبت نہ ہو اور بدقسمتی سے اُسے جوع البقر کا عارضہ بھی نہ ہو تو وہ یہاں آکر کیا کرے، اب رہگئیں دو چیزیں، غلمان و حور، سو غلمان آپ کو مبارک رہیں، البتہ حور دیکھنے کی ضرور تمنا ہے، میرا قصر ابھی سینکڑوں فرسنگ دور ہے، اسلئے اگر حرج نہ ہو تو مہربانی فرما کر ذرا اپنی حور مجھے دکھا دیجئے تاکہ میں فیصلہ کرسکوں کہ اس کے لئے مجھے اتنا طویل سفر اختیار کرنا چاہیئے یا یہیں سے واپس جانا چاہیئے، کیونکہ اسوقت تک جنت میں جو کچھ مجھے نظر آیا ہے وہ بہت ہمت شکن ہے، مولانا کا دماغ اس وقت یا تو کثرت غذا کے بعد ابخرات رویہ پیدا ہونیکی وجہ سے بالکل بجیس تھا۔ یا یہ کہ جنت میں جذبۂ رشک و رقابت پیدا ہی نہیں ہوتا، بہر حال جو سبب بھی رہا ہو، انھوں نے میری اس خواہش پر صرف یہ کہا کہ:۔ "کیا تم نے حوروں کی صفت میں "مقصورات فی الخیام" نہیں سُنا" میں نے عرض کیا کہ:۔ "یہ درست ہے لیکن آپ انھیں "مستورات فی الخیام" تو نہیں رکھ سکتے:۔" مولانا تھے شاید ادیب، یہ جواب سُن کر مسکرا پڑے اور بولے کہ:۔ "بھائی یہ سچ ہے لیکن آج تک کبھی ایسا ہوا نہیں کہ ایک کی حور دوسرے کے سامنے آئے اسلئے ڈرتا ہوں کہ خدا جانے کیا آفت آئے۔" مینے کہا کہ:۔ "آپ کا یہ اندیشہ بالکل بے محل ہے، کیونکہ یہ تو آپکو معلوم ہی ہے کہ جنت کی زندگی دوامی ہے اور اب آپ کو کوئی نکال ہی نہیں سکتا، اس لئے خوب جی کے حوصلے نکالئے اور حسقدر بے عنوانیاں ممکن ہوں عمل میں لائیے۔ اگر یہاں بھی سزا کا دھڑکا لگا ہوا ہے، تو لعنت ہے ایسی جنت پر، اس سے تو دنیا اچھی تھی کہ کم کھاتے تھے اور گناہ زیادہ کرتے تھے، یہاں انسان کھانا زیادہ ہی اور گناہ کوئی نہیں کرسکتا، آپ نے دنیاوی زندگی میں شراب نہیں پی اس کا صلہ آپ کو یہ مل رہا ہے کہ دودھ شہد پیتے رہیئے، کیا اس احتیاط و صبر کا یہی انجام ہونا چاہیئے تھا، ہم تو جب جانتے کہ اگر وہاں یک آتشہ سے توبہ کی تھی تو یہاں دو آتشہ ملتی، دو آتشہ کو وہاں ہاتھ نہ لگایا تھا تو یہاں سہ آتشہ میسر آتی، ایام برشکال میں شب ماہ میں، کنار آب، فرش سبزہ پر، حوروں کے ہاتھ سے خم کے خم لنڈھاتے تو بے شک ایک بات تھی، نہ یہ کہ دودھ پیئے جاؤ، شہد چاٹے جاؤ اور پھر طرہ یہ کہ اس کا نام شراب طہور رکھا ہے۔ آپ نے اگر دنیا میں غیر عورت پر نگاہ ڈالنے سے احتراز کیا تھا تو اس کا عوض یہ نہ ہونا چاہیئے تھا کہ بیوی ہی کی طرح ایک معصوم حور مل جائے، بلکہ اس کے ساتھ وہی جذبات متعلق ہونے چاہیئے تھے جو دنیا میں ایک نہ مل سکنے والی عورت کو دیکھکر پیدا ہوتے تھے۔ اور ہاں یہ تو بتائیے کہ آپ کی بیوی کہاں ہیں۔ کیا وہ ابھی مری نہیں ہیں۔"

—— "نہیں وہ تو مجھ سے پہلے ہی مر گئی تھی۔ لیکن چونکہ وہ اطاعت نہ کرتی تھی اسلئے دوزخ میں ڈالدی گئی۔"

—— "اگر وہ اطاعت کرنیوالی ہوتیں تو کیا صلہ ملتا۔"

—— "یہی کہ وہ اپنے شوہر کے پاس رہتی۔"

—— "معقول یعنی جنت میں بھی اس غریب پر آپ کی معیت و اطاعت کا عذاب مسلط رہتا۔ اور ہاں مولانا یہ تو فرمائیے کہ جو عورتیں اپنے شوہروں سے پہلے مرجاتی ہیں وہ جنت میں کیا کیا کرتی ہیں"۔

—— "اپنے شوہروں کا انتظار"۔

—— "اور اگر وہ شوہر ملحد و مرتد ہو گئے یا کسی اور سبب سے جنت نہ آسکے تو انکی جنتی بیویوں کا کیا حشر ہوتا ہے؟"

—— "پھر تو اسی جنت میں سے کوئی بر تلاش کر دیا جاتا ہے، کیونکہ یہاں بہت سے مرد کنوارے بھی آتے ہیں اور بہت سے ایسے بھی جن کی بیویاں دوزخ چلی جاتی ہیں، بس اُنھیں کے ساتھ ایسی جنتی عورتوں کا نکاح ہو جاتا ہے جو کنواری مری ہیں یا جن کا شوہر یہاں نہیں آسکتا"۔

—— "درست ہے، لیکن قبلہ یہ تو فرمائیے کہ جس طرح ایک نیکوکار مرد کو خواہ اُسکی بیوی ہو یا نہ ہو فوراً حور ملجاتی ہے، اسی طرح کیا عورتوں کو بھی مرد ملجاتے ہیں"۔

—— "لاحول ولاقوۃ، یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی نیک شریف عورت غیر مرد کی خواہش کرے"۔

—— "بالکل اسی طرح جیسے ایک نیک شریف مرد غیر عورت پر قابض ہو جاتا ہے۔ کس قدر ناانصافی ہے کہ ایک مرد کو تو اسکے احتیاط و تقوے کے صلہ میں یہاں حوریں دیجائیں اور ایک محتاط و باعصمت عورت کو یونہیں ٹالدیا جائے۔ دنیا میں غیر عورتوں کو دیکھکر آپ ہی کا جی للچایا ہوگا اور آپ کی بیوی کا ہکو کبھی بیتاب ہوئی ہوں گی۔ اجی جائیے۔ بات یہ ہے کہ پیغمبر جتنے پیدا ہوئے سب مرد تھے، اس لئے مرد کو حور و غلمان سب دیدیا، اگر کوئی عورت کبھی پیغمبر ہو جاتی تو آپ دیکھتے کہ عورتوں کے لئے جنت میں کیسے کیسے حسین و نوجوان مردوں کا انتظام ہوتا۔ سچ ہے غریب عورت کی مٹی دونوں جگہ پلید ہے، اگر بدقسمتی سے دنیا میں کوئی بُرا شوہر ملگیا تو جنت میں بھی اسی بدمعاش کے پاس رہنا ہوگا، یہ بھی کوئی انصاف ہے"۔

—— "خیر ان قصوں کو چھوڑیئے اور اپنی حور کو تو بلائیے تاکہ میں اُس سے لگاوٹ کروں اور آپ میں جذبۂ رقابت مشتعل ہو کہ یہی ہے اصل لذت"۔

مولانا جو شاید خود بھی اپنی بے معنی فردوسی زندگی سے کچھ اُکتا سے چلے تھے کچھ سوچ کر بولے کہ "تم کہتے تو ٹھیک ہو، اچھا میں حور کو بلاتا ہوں، لیکن اگر وہ تم کو دیکھ کر تمہاری طرف مائل ہو گئی تو پھر میں کیا کروں گا"۔ میں نے کہا کہ "قبلہ اول تو ایسا ہو نہیں سکتا کہ آپ ایسے پُرنور، لحیم و شحیم جنتی کو چھوڑ کر وہ مجھ ایسے فاقہ زدہ، ضعیف و نزار شخص کی طرف متوجہ ہو، لیکن اگر خدانخواستہ ایسا ہوا بھی تو کوئی حرج نہیں میں اپنی حور آپ کو دیدوں گا، اچھا ہے، ذرا مزہ بدلجائے گا"۔ یہ سُن کر مولانا نے کچھ تامل فرمایا، اور ر

بولے کہ:- "یہ ٹھیک ہے، لیکن اگر تمہاری حور نے مجھے پسند نہ کیا؟" میں نے کہا:- "تو پھر میں دونوں کو رکھ لوں گا۔" اس پر اُنھوں نے زور سے ایک قہقہہ لگایا اور بولے کہ:- "تم آدمی خطرناک معلوم ہوتے ہو، لیکن خیر کوئی مضائقہ نہیں، آج امتحان ہی سہی۔" یہ کہکر اُنھوں نے زور سے قرات کے ساتھ آواز دی:- "حوراء- حوراء! " اور فوراً حجرہ سے ایک چیز حرکت کرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اور سامنے آکر بے حس و حرکت کھڑی ہو گئی۔ پہلے تو میں یہ غور کرتا رہا کہ اس کا چہرہ کہاں ہے، اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کس جگہ ہیں، کمر سے اوپر کا حصہ کہاں سے اور نیچے کا حصہ کس خط سے شروع ہوتا ہے؟ لیکن مطلق کوئی پتہ نہ چلا، بعد کو جب بہت غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ بی صاحب، سفید چادر میں سر سے پاؤں تک ملفوف ہیں۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ:- "قبلہ، میں نے تو ہمیشہ "حلۂ بہشتی" کے محاورہ کو عریانی کے مفہوم میں استعمال ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ حلۂ بہشتی اس چیز کا نام ہے۔ اے حضرت، ان سے کہیئے کہ خدا کے لئے یہ کفن اُتار کے آئیں، اور جنت میں تو اس چیز کی یاد دلائیں، جس نے لاکھوں کو خانماں برباد کرکے رکھدیا۔" مولانا نے حکم دیا کہ:- "چادر اُتار دو۔" یہ کہنا تھا کہ چادر سانپ کی کینچلی کی طرح خود بخود اتر گئی اور بُت کی طرح بے حس و حرکت ایک نوجوان عورت جو واقعی جمیل تھی نظر آئی، لیکن نگاہیں جُھکی ہوئی تھیں، اور گلے سے گھٹنے تک ایک چادر لپٹی ہوئی تھی جہاں تک منظر کا تعلق ہے، یہ حور واقعی بہت دلکش چیز تھی، لیکن اس کے جمود و سکوت کا یہ عالم تھا کہ مشکل سے میں اُسے ایک سنگین بُت سے ممتاز کر سکتا تھا۔ میں نے کہا کہ:- "مولانا یہ چادر بھی علیحدہ کرائیے، میں بالکل عریاں دیکھنا چاہتا ہوں۔" اور بغیر اس انتظار کے کہ مولانا اُسے ایسا حکم دیں بیتاب ہو کر خود میں نے ہاتھ بڑھایا کہ اس کی چادر علیحدہ کر دوں، لیکن مولانا نے مجھے زور سے ایک ڈانٹ بتائی کہ:- "خبردار، ایسا نہ کرنا، ورنہ میرے ہاتھ سے بھی یہ حور چلی جائے گی، یہ حجاب صرف تاریکی میں اور وہ بھی اس وقت دور ہوتا ہے، جب تھوڑی دیر کے لئے جنتی کی بصارت بھی غائب ہو جاتی ہے۔" یہ سُن کر مجھے ایسا سخت صدمہ ہوا کہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور سوچتا رہا کہ:- "اگر مجھے بھی ایسی ہی کفن پوش حور ملی اور میں اس کی عریانی سے اُن تمام حسرتوں کا انتقام نہ لے سکا جو دنیا میں خدا معلوم کتنی عورتوں کو عریاں نہ دیکھ سکنے سے پیدا ہوئی تھیں، تو ایسی جنت اور ایسی حور سے کیا فائدہ۔ اس وقت میرا دم گھبرا رہا تھا کہ میں نے بھی کیا حماقت کی کہ دنیا میں سینکڑوں پُر مزہ معصیتوں سے محض اس لئے محترز رہا کہ یہاں جی کھول کر اُن کے کرنے کا موقعہ ملے گا، لیکن یہاں تو کمبخت معصیت بھی، طاعت کی طرح بے مزہ ہو کر سامنے آتی ہے۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا، اور حور کے پاس جا کر

اُس حور کا سر اونچا کیا، لیکن نہ ہو سکا، میں نے گدگدی کی، لیکن وہ بے حس کھڑی رہی، مینے اُسکی کمر میں چٹکی لی، لیکن وہ پتھر کی طرح بدستور قائم رہی، اب میری وحشت قابو سے باہر تھی۔ بدحواس ہو کر وہاں سے بھاگا، لیکن اپنے قصر کی طرف رُخ کرنے کے بجائے صدر دروازہ کی طرف دوڑا جارہا تھا اور چیخ رہا تھا کہ "اے خدا! مجھے اس جنت سے نکال، تیری فردوس میرے کسی کام کی نہیں میں یہاں نہیں رہوں گا، ہرگز نہیں رہوں گا، دودھ، شہد کے خیال سے مجھے متلی ہوتی ہے، ایک بیجان و بےحس حور کی طرف متوجہ ہونے سے بہتر ہے کہ میں کسی پتھر کے سامنے اپنا سر جاکر پھوڑ ڈالوں۔ نکال، جلد نکال، میرا دم گھبرا رہا ہے"۔

میری آواز بلند ہوتی جارہی تھی، یہاں تک کہ ساری فردوس اس سے گونجنے لگی، میں بھاگتا جارہا تھا اور یہی کلمات میری زبان پر تھے۔ چاروں طرف سے فرشتوں نے، قرب و جوار کے اہل جنت نے مجھے آکر گھیر لیا اور پوچھنے لگے کہ "کیا بات ہے" لیکن میں نے کسی کی بات کا جواب دیا اور برابر چیختا رہا۔ جب میں صدر دروازہ کے قریب پہونچا تو رضوان نے مجھے روکا اور کہا کہ "تم جنت سے باہر نہیں جاسکتے"۔ میں نے کہا کہ "جناب یہ بھی کوئی زبردستی ہے، میں ایسی لغو و بے معنی جنت میں نہیں رہنا چاہتا، اگر مجھے رکھنا ہے تو میری خواہشوں اور تمناؤں کو پورا کیجئے، جس کا وعدہ کیا گیا ہے ورنہ آپ مجھے دوزخ میں پھینک دیجئے۔ اس سے اچھا یہ ہے کہ میں وہاں جاکر خاک سیاہ ہو جاؤں"۔ رضوان نے پوچھا کہ "تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے عرض کیا کہ "سب سے پہلے تو آپ میرے دفتر سے دودھ، اور شہد کو نکلوائیے، اور اس کے بجائے جانی واکر یا شامپین کی بوتلیں رکھوائیے، جن کے پینے کی حسرت لیکر میں دنیا سے چلا تھا۔ اس کے بعد جو حور صاحبہ وہاں موجود ہیں ان کو کسی مولانا کے سپرد کر دیجئے، اور مجھے تو کوئی گوشت پوست والی عورت مرحمت فرمائیے، جس کے جسم میں لوچ ہو، اداؤں میں احتراز ہو، عشوہ و ناز ہو، جو میرے بلانے سے نہ آئے، میں ہات لگاؤں تو ہات جھٹک دے، گالیاں سنائے، میں کمر میں ہاتھ ڈالنا چاہوں تو وہ ناگن کی طرح سمٹ کر کترا کر نکل جائے، میں دامن تھاموں وہ دامن جھٹک کر گزر جائے"۔ رضوان نے کہا کہ "جنت میں تو ایسی کوئی حور نہیں"۔ میں نے عرض کیا کہ "پھر بندہ کا بھی یہاں رہنا ضرور نہیں"۔

رضوان یہ سُن کر کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر بولا کہ "تم کو حوروں میں کس چیز کی کمی نظر آتی ہے اور ان میں کیا بُرائی ہے"۔ میں نے عرض کیا کہ "ان میں خوبی کیا ہے، لیکن آپ بھلا کیوں ماننے لگے، اچھا یوں نہیں، پہلے آپ یہ بتائیے کہ "آپ نے کبھی عشق کیا ہے؟" رضوان یہ

یہ سُن کر گھبرایا اور بولا کہ:۔ "میں اس لفظ کے مفہوم سے قطعی نا آشنا ہوں"۔
— "اچھا یہ تو بتایئے کہ حوروں کو دیکھکر آپ کا جی کیا چاہتا ہے؟"
— "کچھ نہیں"۔

یہ سُن کر میں نے اپنا منھ پیٹ لیا اور بولا کہ:۔ "واہ جی اللہ میاں، آپ نے بھی کس احمق کو رضواں بنایا۔ ارے اس بے حس مُردہ کو دوزخ میں بھیجدے، اور ہمیشہ کے لئے نہ سہی تو صرف چند دن کے لئے امتحاناً یہ منصب میرے سپرد کردے، پھر دیکھ کہ تیری جنت کو کیا چیز بنائے دیتا ہوں، اگر دن دہاڑے، سب کے سامنے نہیں، حوروں کے لئے باہم جنتوں میں چھُریاں نہ چلوادی ہوں تو سہی"۔

رضواں جو میری بیتابی کو دیکھ کر ہنس رہا تھا بولا کہ:۔ "اچھا تم خود پہلے کسی حور سے دریافت کرکے دیکھو کہ وہ تمہاری تربیت سے درست ہوسکتی ہے یا نہیں"۔ یہ کہکر اس نے تالی بجائی اور اسی وقت زمین سے ایک حور نکلی۔ میں نے پہلے اُسے سر سے پانوں تک بغور دیکھا اور پھر قریب جاکر سوال کیا:۔

"تم کون ہو" — "میں حور ہوں"
"تم مرد ہو یا عورت" — "معلوم نہیں"
"میں کون ہوں" — "مجھے نہیں معلوم"

"اچھا یہ بتاؤ کہ مجھے اپنے سے اس قدر قریب دیکھ کر تمہارا جی کیا چاہتا ہے؟" جواب ملا "کیا؟" میں نے کہا کہ "میں جو تم سے اسقدر متصل کھڑا ہوں، تو تمہارا جی یہ چاہتا ہے کہ یہ تھوڑا سا فاصلہ بھی جاتا رہے یا یہ کہ تم میرا منھ نوچ لو۔ میری پیٹھ پہ دوہتڑ مار کر بھاگ جاؤ" — "میں نہیں جانتی" — "تمہاری عمر کیا ہے" — "معلوم نہیں"
— "تم جوان ہوگئی ہو یا نہیں" — "معلوم نہیں"

اب مارے غصہ کے میں کانپنے لگا اور پریشان ہوکر اپنی دو انگلیاں اس کے سامنے لیجاکر بولا کہ:۔ "اچھا یہی بتا کہ کتنی انگلیاں ہیں"۔ اس کا جواب اُس نے وہی دیا کہ "مجھے نہیں معلوم"۔ — اب میں بالکل بے قابو ہوگیا اور جی میں آیا کہ زور سے ایک لات مار کر وہیں پہونچادوں، جہاں سے وہ آئی ہے، لیکن رضواں نے مجھے روک لیا — میں نے کہا "سنئے جناب، یہ ہے جنت اور مجھے اب یہاں سے جانا نہیں، اسلئے کام یوں نہ چلے گا۔ یہ جو آپ نے ہر بات کے جواب میں "معلوم نہیں" کہنے والی ناکارہ حوریں بھرلی ہیں، یہ سب کی سب نکال دینے کے قابل ہیں۔ یا تو آپ خدا سے اجازت لیکر مجھے اپنی جگہ کام کرنے دیں تاکہ میں خود خدا سے اس کا فیصلہ کرلوں، یا پھر آپ ہی جلد اس کا انتظام کیجئے، ورنہ میں یہاں اس قبرستان میں

ایک لمحہ زندگی نہیں بسر کرسکتا"۔ رضواں نے کہا کہ "آپ اپنی تجویز تو بتایئے کہ کیا ہے"۔ میں نے کہا" سنئے اس کی ایک ترکیب تو یہ ہے کہ جنت کی تمام موجودہ حوروں کو فنا کر دیجئے، اور از سر نو نئی حوریں بنوایئے۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ فردوس کی زمین یا یہاں کی کسی اور چیز سے ان کا خمیر نہ کیا جائے، بلکہ دنیا کی کسی ایسی سرزمین سے انکی تعمیر ہونا چاہیئے، جہاں عورت کا مفہوم ہی معصیت اور حرامکاری ہے۔ اسکے لئے فی الحال یورپ کی سرزمین موزوں ہوگی۔ موجودہ حور کے اعضا میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ مدراس کے بال، بنگال کی آنکھ، پنجاب کی ناک، کشمیر کا چہرہ، امریکہ کی گردن، فرانس کا قد، اسپین کی لچک، سرکیشیا کا رنگ اور حبشی عورتوں کا سینہ حاصل کیجئے۔ جب اس طرح انکی تعمیر ہوجائے اور جان ڈالنے کا وقت آئے تو خون کے ساتھ پارہ بھی ملا دیجئے، اور ان کے دل میں یہ کیفیت پیدا کیجئے کہ جب مردوں کو دیکھیں تو بیتاب ہوجائیں، لیکن زبان سے اس کا اظہار نہ کرسکیں۔ اسی کے ساتھ ان میں شان احتراز پیدا کیجئے، عشوہ و ناز، لگاوٹ اور الوٹ کی باتیں سکھایئے، گانا، ناچنا بتایئے، اور ہاں یہ سکھانا نہ بھول جائیگا کہ صرف آنکھوں سے کیونکر مسکراتے ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ تمام اہتمام آپکے بس کی بات نہیں، اسلئے سب سے زیادہ آسان تدبیر یہ ہے کہ جتنی عورتیں اسوقت دوزخ میں موجود ہیں، ان سب کو حور بنا دیجئے، کیونکہ یقیناً یہ عورتیں حسین بھی ہوں گی۔ اور جذبات جنسی بھی بہت قوی رکھتی ہوں گی۔ ورنہ وہ دوزخ بھیجی ہی کیوں جاتیں۔ اگر آپ اس میں کامیاب ہوگئے تو پھر دیکھئے کہ جنت کیا چیز ہوئی جاتی ہے۔ کوئی حور گا رہی ہے۔ کوئی گھونگھرو باندھے چھم چھم ناچ رہی ہے، کوئی ساغر بھر بھر کر پلا رہی ہے، کوئی گلے میں باہیں ڈالے پڑی ہے۔ بھئی رضواں، تمہیں انصاف کرو، کہ اسوقت کیا عالم ہوگا، ایک ایک جنتی پڑا اینڈ رہا ہوگا، آنکھوں میں سرسوں پھولی ہوگی۔ اور پوری طرح داد لذت دے رہا ہوگا۔ لیکن اس مشورہ کے عوض میں میری ایک خواہش آپکو پوری کرنی ہوگی اور وہ یہ کہ جب عورتیں دوزخ سے نکال کر حوریں بنائی جائیں تو پہلا حق انتخاب مجھے دیا جائے تاکہ سب سے پہلے میں قلو لطرہ ملکہ مصر کو الگ کرلوں، مجھے بڑی آرزو ہے کہ اپنی ایک سرشاررات سے پورا لطف اٹھا لینے کے بعد مجھے بھی اپنے نازک ہاتھوں سے ایک جام زہر پینے کے لئے دے۔ آہ، میاں رضوان تمہیں نہیں معلوم کہ دنیا میں ہمیشہ ہینے ظالم ہی عورتوں پر جان دی ہے۔ اور اس لئے اگر میں اپنی اس ستم رسیدگی کا انتقام قلو لطرہ سے نہ لے سکا جو دنیا کی سب سے زیادہ سفاک بے رحم عورت تھی، تو تف ہے میرے جنتی ہونے پر"۔ رضواں نے سنا اور مسکرا کر کہا کہ "اس انتظام کے لئے تو بہت زمانہ درکار ہے، فی الحال تم دنیا میں سے کسی کا انتخاب کرلو تاکہ تمہاری ضد تو پوری ہو"۔ میں نے یہ سنتے ہی بغیر سوچے سمجھے گھبرا کر کبن ہوٹل کا پتہ دیدیا اور چشم زدن میں وہی ساحرہ اپنے اسی سیاہ ریشمی لباس میں لچکتی ہوئی سامنے سے نمودار ہوئی۔ لیکن قبل اسکے کہ وہ مجھ تک

پہونچتی، ساری فردوس میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور ہر جنتی چیخ اٹھا کہ "ہمیں بھی، ہمیں بھی، ہمیں بھی" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہزاروں سال کے سوئے ہوئے جذبات ان کے دفعتہً بیدار ہو گئے تھے۔ میں اس کو جلدی سے قریب ہی کے ایک خیمہ میں لے گیا۔ لیکن کمبخت جنتیوں نے وہ یورش مچائی کہ خدا کی پناہ، خیمہ کی طنابیں کاٹ دیں، قناتیں پھاڑ ڈالیں اور میں چونک پڑا ——

صبح کا وقت تھا اور نظیر کا یہ شعر زبان پر

صبح ہوئی گجر بجا، پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اُٹھ گیا جی ہی میں جی کی رہ گئی

جب برکفاسٹ اور لنچ کے وقت پھر میں نے اسکو اپنی کرسی پر پورے غرور حسن کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھا تو میں جی ہی جی میں مسکرایا کہ ابھی چند گھنٹے کی بات ہے کہ رات کو یہ کشاں کشاں سامنے لائی گئی تھیں اور میرے ہر اشارہ پر سر جھکانے کیلئے تیار تھیں۔ لیکن اسوقت یہ عالم ہے کہ گویا کبھی دیکھا ہی نہیں اور کچھ جانتی ہی نہیں۔ اللہ اللہ!

یہ لوگ بھی غضب کے ہیں دل پہ یہ اختیار
شب موم کر لیا سحر آہن بنا لیا

نیاز

اطلاع بنام دائنان نسبت تعین تاریخ سماعت درخواست دیوالہ

(دفعہ ۹ ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲ء) بعدالت جناب سب جج صاحب بہادر اول مقام بہرائچ

درخواست دیوالہ نمبر ۳ سنہ ۱۹۳۱ء بمقدمہ قرار دیئے جانے دیوالیہ مسمی بودھن ولد ادری قوم

راڑہ ساکن موضع اجوا پور پرگنہ نانپارہ ضلع بہرائچ سائل بنام رام ہت وغیرہ مہاجنان

ہرگاہ مسمی بودھن ولد ادری سائل مذکورہ بالا نے عدالت ہذا میں بذریعہ عرضی مورخہ ۲۱ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء درخواست کی ہے کہ وہ حسب منشاء ایکٹ دیوالیہ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء دیوالیہ قرار دیا جاوے اور تمہارا نام فہرست دائنان میں جو مدیون نے داخل کی ہے پایا جاتا ہے لہذا تمکو اطلاع دیجاتی ہے کہ عدالت نے تاریخ ۵ ماہ مئی سنہ ۱۹۳۱ء واسطے سماعت درخواست مذکور الصدر اور نیز بیان مدیون کے مقرر کی ہے۔ اگر تم کچھ اس معاملہ میں پیروی کرنا چاہتے ہو تو اصالتاً یا بذریعہ وکیل جو حال مقدمہ سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو حاضر ہو۔

آج بتاریخ ۲۲ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۱ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

دستخط حاکم بخط انگریزی (مہر عدالت)

وقت حاضری بدفتر بہرائچ ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک

زبان اُردو کے تنزل کے اسباب اور ہندوستانی اکاڈمی

دنیا میں جس طرح اور زبانیں عالم وجود میں آئیں - اُسی طرح زبان اردو نے بھی تدریجًا ایک ایسی صورت اختیار کرلی ہے کہ اب اُس کا شمار دنیا کی شستہ زبانوں میں ہونے لگا ہے - البتہ فرق یہ ہے کہ دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اُردو کی ابتدا پردۂ خفا میں نہیں ہے - قدما کی نظم و نثر کے جستہ جستہ ٹکڑے ابتک موجود ہیں جن سے اُردو کی ابتدائی کیفیت اب بھی معلوم کیجاسکتی ہے - اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس زبان نے اور زبانوں کی بہ نسبت بہت جلد ترقی کی ہے - اور ترقی کرنے کے بعد اتنی زیادہ مقبول خاص و عام ہوئی کہ آخرکار مادری زبان بن گئی -

اب اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں وہ تمام لوازم زبان موجود ہیں جن سے ایک زبان زبان کہی جاسکتی ہے - اس زبان میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لئے ہر طرح کی بندشیں موجود ہیں - اور شعرا اور ادبا کی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی نے فصاحت کے معیار کو بہت بلند کردیا ہے -

چونکہ یہ زبان اور زبانوں کے مقابلہ میں بہت نئی ہے اور بہت سی زبانوں کے امتزاج سے بنی ہے - اس لئے اگر اس کو خاتم السنۂ ہند کہا جائے تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا - وہ تمام خوبیاں جو اور زبانوں میں فردًا فردًا موجود ہیں وہ سب کی سب اجتماعی حیثیت سے اُردو زبان میں موجود ہیں - اس میں قریب قریب ہر مخرج کی آوازیں موجود ہیں جن کی وجہ سے اس زبان کا بولنے والا اور زبانوں کے تلفظ کو بآسانی سیکھ سکتا ہے - اس سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اُردو زبان میں کوئی خامی نہیں - ایک ہندوستانی کو یقینًا فرانسیسی A جرمنی O و Z و CH وغیرہ کے تلفظ ادا کرنے میں دقت پڑے گی - مگر دوسرے ملکوں کے باشندوں کے مقابلہ میں وہ یقینًا ایک غیر مادری زبان کا تلفظ اچھی طرح ادا کرسکے گا -

ہر زبان میں چند خصوصیات ہوا کرتی ہیں جن کی وجہ سے وہ زبان اور زبانوں سے درجۂ امتیاز رکھتی ہے اسی طرح اُردو زبان میں بھی چند خصوصیات ہیں - اور انھیں خصوصیات کا جاننا اردو زبان کا جاننا ہے - ان خصوصیات کے اعتبار سے ہندی اور اردو میں بجز اس کے کوئی فرق نہیں ہے کہ اُردو میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے اور ہندی میں سنسکرت کے الفاظ کی - مگر جہاں تک جملوں کی بندش اور نشست الفاظ

کا تعلق ہے دونوں زبانیں بالکل ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ اس لئے اردو کی ترقی ہندی کی ترقی ہے اور اردو کا تنزل ہندی کا تنزل ہے۔ رسم خط سے زبان نہیں بدل سکتی ہے۔ اور نہ اُسکے محاورات بدل سکتے ہیں۔ البتہ اگر جہلا کی دستبرد سے محاورات اور انداز بیان میں فرق آیا تو چاہے ہم اُن جملوں کو خط نسخ میں لکھیں یا خط نستعلیق میں۔ دیا نوگری کے خط میں لکھیں یا مرہٹی میں۔ ہر حالت میں زبان میں ایک ایسا نقص عظیم پیدا ہو جائے گا۔ جس سے ہمارے بزرگوں کی سالہا سال کی محنت اور مدت دراز کی عرق ریزی جس سے اُنھوں نے اس ننھے پودے کو سینچکر پروان چڑھایا تھا۔ خاک میں ملجائیگی۔

زبان اردو کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ الفاظ کی تذکیر و تانیث۔ یہ فرانسیسی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ عربی زبان میں بھی ہے مگر بہت کم جرمنی میں تذکیر و تانیث کے علاوہ ایک تیسری نوعیت بھی ہے اور الفاظ کی تذکیر و تانیث محض استعمال پر ہے یا یوں کہئے کہ یہ امر سماعی ہے۔

۲۔ صیغوں کا استعمال۔ صیغوں کا استعمال بھی اردو زبان کے لئے مخصوص ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو کسی دو زبانوں میں صیغہ کا استعمال ایک نہ ملے گا۔ ایک معمولی سی مثال یہ ہے:۔

اردو۔ میں نے آپ سے کہدیا تھا

انگریزی۔ I HAD TOLD YOU

۳۔ حرف جار کا استعمال۔ اس میں بھی زبان اردو کی خصوصیت نمایاں ہے۔

اُردو۔ میں سڑک پر جارہا تھا۔

انگریزی۔ I WAS GOING BY ROAD

۴۔ محاورات زبان۔ مثلاً مجھکو یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ وہ گئے اُس نے دیکھا نہ سُنا۔

۵۔ بندش الفاظ۔ اُردو زبان کی بندش ایک خاص طرح کی ہے۔ صلہ اور موصول کا استعمال بہت کم ہے۔ جملے مختصر ہوتے ہیں۔ الفاظ میں روانی ہوتی ہے۔

۶۔ نشست الفاظ۔ وہی لفظ ایک جملے میں فصیح ہوتا ہے اور دوسرے میں غیر فصیح۔ حضرت انیس فرماتے ہیں:۔ "کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہو"۔ یہاں شبنم کہنا غیر فصیح ہے۔

۷۔ معانی الفاظ۔ جس طرح لاطینی زبان کے الفاظ جب انگریزی فرانسیسی جرمنی زبانوں میں داخل ہوئے ہیں تو انکا مفہوم کچھ بدل گیا ہے۔ اسی طرح جو عربی اور فارسی الفاظ اُردو میں داخل ہوئے اُنکا مفہوم بھی استعمال کی بنا پر بدل گیا ہے۔

انگریزی COMPLIMENTS - سلام

فرانسیسی COMPLIMENTS (تلفظ CONPLIMAN) مبارکباد۔

اسی طرح اُردو زبان میں بھی مفہوم بدلا ہے۔

اردو۔ گلاس - پانی پینے کا برتن جو استوانہ کی مخروطی صورت کا ہوتا ہے۔

انگریزی۔ GLASS - شیشہ

فارسی - غصہ - پریشانی جس میں غم غالب ہو۔

اردو - غصہ - خشم۔

عربی - غصہ - گلے میں پھنسنا - ضبط کرنا۔

۸- تبدیلی الفاظ - جس طرح انگریزی فرانسیسی وغیرہ میں بعض لاطینی الفاظ ایک بدلی ہوئی صورت میں استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح اُردو زبان میں بھی بعض الفاظ بدلی ہوئی صورت میں استعمال ہوئے ہیں۔

عربی۔ کیفیت - خیریت - بہ تشدید یا

اردو۔ کیفیت - خیریت - بغیر تشدید یا

انگریزی۔ LANTERN اردو لالٹین

انگریزی۔ BISCUIT (تلفظ لسبکٹ) اردو لسبکٹ۔

انگریزی۔ ENGINE (تلفظ انجن) اردو انجن

۹- جاذبیت الفاظ - چونکہ اُردو زبان میں قریب قریب ہر مخرج کی آواز موجود ہے۔ اس لئے ہر زبان کا تلفظ بہت آسانی سے اُردو زبان میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ ایسے الفاظ بہت کم نکلیں گے۔ جو اردو زبان میں بہت زیادہ ناموزوں معلوم ہوں۔ اگر ترجمہ کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو...... (AEROPLANE , THERMOMETER) وغیرہ اردو زبان میں نئے نہیں معلوم ہوتے۔

۱۰- تغیر الفاظ - بعض الفاظ جو پرانے زمانے میں فصیح تھے اب متروک ہوگئے ہیں۔ مثلاً اپنے تئیں ٹک - پس - (لہذا کے معنی پر) بن وغیرہ۔

لہذا میرے خیال میں اُردو زبان اُسی شخص کو آتی ہے جسکو محاورات زبان پر عبور ہو۔ جو صیغوں کا صحیح استعمال جانتا ہو۔ جملوں کے تناسب سے واقف ہو اور اُردو کی صحیح بندش کو سمجھتا ہو۔ ساتھ ہی سکے یہ بھی جانتا ہو کہ جو الفاظ اُردو زبان میں استعمال ہو رہے ہیں خواہ وہ عربی زبان کے ہوں یا کسی اور زبان

کے اُن کا مفہوم اُردو میں کیا ہے نیز انکا صحیح تلفظ کیا ہے۔ ساتھ ہی اس کے یہ بھی جانتا ہو کہ کون کون سے الفاظ و محاورات متروک ہو گئے ہیں۔

یہ کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ ایک زبان کا لفظ جب دوسری زبان میں استعمال ہو تو اُسکا مفہوم وہی ہو جو اُسکی اصل زبان میں تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ زبان اردو میں چراغ کا مفہوم فارسی کے چراغ یا عربی کے سراج سے بالکل مختلف ہے۔ اردو کا چراغ ایک مدور برتن ہوتا ہے۔ جس میں کڑوا تیل بھرا ہوتا ہے اور ایک فلیتہ پڑا ہوتا ہے۔ فارسی میں ہم فارسی مفہوم کے اعتبار سے چراغ ہدایت کہہ سکتے ہیں۔ مگر اردو میں اگر کسی آدمی سے کہا جائے کہ آپ ہدایت کے چراغ ہیں تو وہ اسکو یقیناً مذاق سمجھیگا۔ اردو کی فکر اور فارسی کی فکر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح قریب قریب ہر اُس لفظ کے مفہوم میں جو اردو اور فارسی دونوں میں استعمال ہوتا ہے نمایاں فرق ہے۔

غالباً اس تحریر سے یہ پوری طرح واضح ہو گیا ہوگا کہ اگر کوئی شخص مندرجہ بالا باتوں سے واقف نہیں ہے۔ تو اُسے ہم کسی حالت میں اردو داں نہیں کہہ سکتے ہیں۔ عربی اور فارسی پڑھ جانے سے کوئی شخص اُردو داں نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر عرب کا باشندہ اپنے آپ کو اردو کا ایک بہترین زباندان تصور کرنے لگتا۔ اصل تو یہ ہے کہ عربی دانی اور فارسی دانی سے چند مشکل لغتوں کے معنی ضرور معلوم ہو جاتے ہیں، مگر ثقیل اور نامانوس لفظوں کے معنی جان لینا اردو دانی نہیں ہے۔ زیادہ عربی دانی سے یہ نقص پڑتا ہے کہ انسان اس بات کو بالکل بھول جاتا ہے کہ عربی اور فارسی الفاظ کا مفہوم زبان اردو میں کیا ہے اردو زبان کو جانتے کے لئے اصل میں پہلی چھ خصوصیات بہت ضروری ہیں۔ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ مگر ہم آج کل یہ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ اُنھیں خصوصیات کو بالائے طاق رکھکر محض الفاظ کے جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اسکی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ مختلف زبانوں کے پڑھنے سے چند الفاظ کا مفہوم جو دوسری زبانوں میں ہے معلوم ہو جاتا ہے۔ لہذا نزاع لفظی کی سوجھتی ہے۔ باقی رہے محاورات زبان۔ صیغوں کا استعمال۔ بندش الفاظ ان سے قطعاً نابلد رہتے ہیں۔

جن حضرات کا یہ خیال ہے کہ بعض اُردو الفاظ کی تشریح جان لینے سے انسان اردو دان ہو سکتا ہے وہ سراسر دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ فیلو لوجی کسی زبان کا ادب سیکھنے کے لئے بالکل غیر ضروری ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ فیلو لوجی سے صحیح ادبی مذاق بالکل مفقود ہو جاتا ہے۔ مثلاً شمشیر کی تشریح۔ سم = ناخون اور شیر سے ایک فیلو لوجی جاننے والے کا خیال لفظ شمشیر کو سُن کر فوراً شیر کے ناخون کی طرف منتقل ہوگا۔ لہذا وہ شمشیر کے ادبی مفہوم کے سمجھنے میں قاصر رہے گا۔ اور اُس کا طرز تخئیل ایک اردو داں کے طرز تخئیل سے

کچھ مختلف ضرور ہوگا۔

دوسری مثال یہ ہے۔ اگر کسی شخص کو معلوم بھی ہو گیا کہ خندق کندک سے نکلا ہے اور اُسکو یہ نہیں معلوم کہ خندق کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے تو بہت ممکن ہے کہ وہ خندق کو کنوئیں یا تالاب کے معنوں میں استعمال کرنے لگے۔ ساتھ ہی اس کے اگر خندق کی اصلیت کندک معلوم بھی ہو گئی تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کندک کہاں سے آیا اور اگر اس کا مخرج بھی معلوم ہو گیا تو وہ لفظ کہاں سے نکلا۔ وہمچنیں مسلسل بہرحال اس جھگڑے میں پڑکر زبان اُردو پس پشت پڑ جاتی ہے اور ایک انسان غیر ضروری باتوں میں اُلجھ جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص زبان اُردو میں گفتگو کرتا ہے اُس وقت وہ ہر لفظ کو اردو سمجھتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ لفظ عربی سے مشتق ہو یا لاطینی سے اور اُس کا خیال بھی فیلولوجی کی طرف نہیں پہونچتا ہے۔

اس موقع پر یہ بیان کر دینے کی ضرورت ہے کہ زبان اُردو میں اس وقت کون سی خامیاں ہیں۔ اردو کے خزانہ میں اسوقت ادبی حیثیت سے ہر قسم کی نظم و نثر موجود ہے۔ اگر نثر میں غور کیا جائے تو جتنی صورتیں نثر کی تمام روئے زمین کی زبانوں میں ہیں وہ سب اردو میں موجود ہیں۔ نظم میں کوئی ایسی صنف نظم کی نہیں جو اردو میں نہ ہو۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر ہم اردو کی صرف ایک بحر متدارک پر غور کریں۔ تو یہ معلوم ہوگا کہ روئے زمین کی شاعری زیادہ تر اسی بحر میں ہے۔

LIVES OF GREAT MEN ALL REMIND US
WE CAN MAKE OUR LIVES SUBLIME

فعل فعولن فعلن فعلن فعل فعولن فعلن فاع مع زحافات

مضمون کے اعتبار سے اب بھی اردو کی شاعری کسی طرح دنیا کی تمام شاعری سے کم نہیں۔ البتہ زبان اردو میں جس بات کی کمی ہے وہ موجودہ سائنس کے علمی مضامین ہیں۔ اسکی وجہ بہت کچھ تو نامساعدت وقت ہے اور کچھ ہم لوگوں کی کوتاہی ہمت۔ اس کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ جب وہ وقت آئے گا کہ سائنس زبان اردو میں پڑھائی جائے گی تو لامحالہ ہم کو بعض الفاظ زبان اردو میں داخل کرنا پڑیں گے۔ مگر یہ کام صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جنھیں اردو کا صحیح مذاق ہو۔ جو زبان اردو پر عبور رکھتے ہوں اور یہ سمجھتے ہوں کہ کونسا لفظ زبان اردو کے لئے موزوں ہے اور کون سا ناموزوں۔ ہر شخص کا کام نہیں کہ وہ اس دشوار مسئلہ میں رائے زنی کرے اور ایک نیا لفظ زبان اُردو میں داخل کر کے زبان کے مذاق کو خراب کرے۔

آج کل تو یہ حالت ہے بقول غالب ؎

ہر بوالہوس نے عشق پرستی شعار کی   اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

ہر شخص اپنے آپ کو زبان اردو کا مسلم الثبوت اوستاد سمجھتا ہے۔ اور بعض حضرات کا تو یہاں تک دعوٰے ہے کہ دنیا میں کوئی آدمی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔ مگر جب ہم غور سے دیکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض حضرات جو زبان اُردو کی توسیع میں پڑے ہوئے ہیں اُن کی وہی حالت ہے جو انگریزی مدارس کے آٹھویں درجہ کے طالب علموں کی ہوتی ہے۔

ایک طالب علم جب زبان انگریزی سیکھنا شروع کرتا ہے تو وہ اردو میں سوچتا ہے اور اپنے مفہوم کا ترجمہ زبان انگریزی میں کرتا ہے۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کو زبان انگریزی میں الفاظ ہی نہیں ملتے ہیں اور وہ غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے مثلاً FAT (فیٹ) کے معنی موٹا یا پڑھنے کے بعد جب وہ موٹی کتاب کا ترجمہ کرتا ہے تو بے تکلف A FAT BOOK لکھدیا کرتا ہے۔ جب اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ END OF THE ROOM کے معنی مکان کا کنارہ ہیں۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ کنارے کے لئے زبان انگریزی میں ENDE لکھتے ہیں۔ پس کچھ تعجب نہیں اگر وہ دریا کنارے کے لئے زبان انگریزی میں END OF THE RIVER لکھدے۔ ابھی حال ہی کا واقعہ ہے کہ مجھے ایف اے کے ایک طالب علم کے انگریزی مضمون دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اُس بیچارے نے زبان انگریزی کی یوں توسیع کی تھی۔

SO FAR THE REFORMATION WAS PURGATIVE IN THE OLD RELIGION

اس جملہ میں لفظ (PURGATIVE) اردو تخئیل ادا کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اس لفظ کے استعمال سے اُردو داں حضرات کہاں تک بہرہ یاب ہوئے۔

چونکہ آج کل انگریزی مدارس میں تعلیم زبان انگریزی ہی میں دیجاتی ہے اور طالب علموں سے اس بات کی مشق کرائی جاتی ہے کہ وہ زبان انگریزی ہی میں سوچیں اور اپنا مفہوم زبان انگریزی میں ادا کریں۔ اس لئے کچھ عرصہ کے بعد جب زبان انگریزی کی مہارت بڑھجاتی ہے اور انگریزی میں سوچتے سوچتے زبان اردو کے محاورے بالکل بھول جاتے ہیں۔ اُسوقت ایک ہندوستانی آدمی اپنی زبان کو خیرباد کہہ کے زبان انگریزی میں سوچتا ہے لکھتا ہے اور اپنی تقریر میں آدھے الفاظ انگریزی کے استعمال کرتا ہے۔ اُس کے جملوں کی بندشیں بالکل انگریزی ہوجاتی ہیں اور اُسے ہر جملے کو مکمل کرنے کے لئے زبان انگریزی کی خوشہ چینی کرنی پڑتی ہے اور اردو کے صرف وہ الفاظ یاد رہجاتے ہیں جن کے مترادف زبان انگریزی میں ایک حد تک موجود ہیں اور وہ تمام الفاظ و محاورات جو زبان اردو کے لئے مخصوص ہیں بالکل بھول جاتے ہیں۔ چونکہ دو مختلف زبانوں میں

ایک ہی مفہوم ادا کرنے کے لئے مترادف و ہم معنی الفاظ کا ملنا بہت مشکل ہے۔ اسلئے ایسے اردو الفاظ کی تعداد جن کا مترادف زبان انگریزی میں موجود ہو۔ قاعدے سے بہت کم ہونا چاہیئے۔ مگر چونکہ اردو بہت وسیع زبان ہے اور اس میں زبان انگریزی سے کہیں زیادہ الفاظ موجود ہیں۔ اس لئے کچھ مترادف الفاظ انگریزی مفہوم ادا کرنے کے لئے مل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اردو الفاظ کی تعداد جنکا مترادف زبان انگریزی میں موجود ہو زبان انگریزی کے مقابلہ میں یقیناً کم ہوگی۔ اس لئے ایسے انگریزی داں حضرات کو زبان اردو بالکل محدود نظر آتی ہے۔ اُن کو قدم قدم پر اپنا خیال ادا کرنے کے لئے اُردو الفاظ نہیں ملتے اور وہ اُسے اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں کہ جسطرح ممکن ہو زبان اردو کی توسیع کیجائے اور توسیع بھی یوں ہو کہ انگریزی الفاظ کا ترجمہ زبان اُردو میں کر دیا جائے۔ عام اس سے کہ وہ اردو الفاظ جو انگریزی الفاظ کے مترادف قرار دیے جائیں اُنکا مفہوم زبان اردو میں چاہے کچھ ہی ہو۔ اگر ایسے حضرات کو زبان اردو پر عبور ہوتا اگر وہ محاورات زبان سے واقف ہوتے اور اگر وہ زبان اردو میں بھی سوچنے کی قابلیت رکھتے ہوتے تو غالباً ان کو الفاظ ملنے میں بالکل دقت نہ ہوتی۔

مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بعض قابل ہندوستانی انگریزی داں حضرات کو جب کبھی اردو یا ہندی میں تقریر کرنی پڑی یا خطبہ صدارت پڑھنا پڑا تو انھوں نے اپنی تقریر پہلے انگریزی میں لکھ کر اُردو یا ہندی میں ترجمہ کرایا۔ ایک مترجم نے بھولے سے کچھ ٹھیٹ اردو الفاظ استعمال کر دیے۔ یعنی ایسے الفاظ استعمال کئے جن کے مترادف زبان انگریزی میں نہیں ہیں۔ بس کیا تھا بگڑ گئے اور اُن پر یہ الزام لگایا کہ تم نے عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار کر دی ہے۔

آپ لوگ اگر غور سے دیکھیں گے تو یہ صاف ظاہر ہوگا کہ ہر اُس شخص کے اُردو مضامین میں جو زبان انگریزی میں سوچنے کا خوگر ہے صرف وہ الفاظ ملیں گے جنکے مترادف زبان انگریزی میں موجود ہیں۔ ایسے حضرات کے مضامین میں وہ الفاظ قطعاً نہ ملیں گے۔ جن کا مفہوم ادا کرنے کے لئے زبان انگریزی میں کوئی لفظ نہیں۔ مثلاً آن۔ بان۔ ناز۔ ادا۔ نادان [illegible] وغیرہ۔ اس حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو انگریزی داں حضرات کی اُردو دانی اُن کی انگریزی قابلیت کی وجہ سے محدود ہو گئی ہے۔ اور اُن کو محض تھوڑے سے اردو الفاظ معلوم ہیں۔ جن کی تعداد اُن انگریزی الفاظ سے یقیناً کم ہے جو انھیں باوجود ہندوستانی ہونے کے معلوم ہیں۔

ایسے لوگوں کی عبارت میں زیادہ تر خود ساختہ الفاظ ملیں گے جو اُن کے خیال میں زبان انگریزی کے الفاظ کے مترادف ہیں۔ مثلاً زبان انگریزی میں PRODUCT OF THE FIELD کے معنی ہیں

کھیت کی پیداوار۔ لہذا انھوں نے سمجھ لیا کہ جہاں کہیں لفظ PRODUCT ہو اُس کے معنی پیداوار ہوں گے۔ اس قاعدے سے PRODUCT OF THE BRAIN کا ترجمہ دماغ کی پیداوار ہوا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ویسی ہی غلطی ہے جیسے ایک بچہ نے موٹے کے معنی FAT سمجھکر موٹی کتاب کا ترجمہ FAT BOOK کردیا۔

جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں دو زبانوں میں ایسے الفاظ کا ملنا ایک حد تک ناممکن ہے۔ جنکا مفہوم ہر نوعیت سے ایک ہو۔ یہ ممکن ہے کہ چند محاورات میں دو مختلف زبانوں کے الفاظ ایک ہی مفہوم ادا کرنے کے لئے استعمال ہوں مگر ضرور کوئی نہ کوئی ایسا محاورہ مل جائے گا جس میں صرف ایک ہی زبان کا لفظ استعمال ہوتا ہوگا۔ مگر دوسری زبان کا نہیں۔ ایک معمولی لفظ GOOD ہے جسکا مفہوم قریب قریب وہی ہے جو اردو میں لفظ اچھے کا ہے۔ مگر پھر بھی اُردو کے لفظ اچھے میں COMPARISON کی شان موجود ہے۔ جو انگریزی لفظ (GOOD) میں نہیں۔ اُردو میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں "ان سب میں یہ کتاب اچھی ہے۔ مگر انگریزی میں ایسا نہیں کہہ سکتے۔ علاوہ بریں انگریزی میں ایک خاص محاورہ FOR GOOD ہے۔ جس میں GOOD اور اچھے کے مفہوم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لئے یہ اصولی غلطی ہے کہ پہلے ایک انگریزی لفظ کے کسی خاص مفہوم کا ترجمہ زبان انگریزی میں کیا جائے۔ پھر اس اُردو لفظ کا اطلاق ہر اُس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے ہو جہاں ہم اُس کے انگریزی مترادف کو استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ وہ غلطی ہے جو انگریزی خواں حضرات یا دانستہ کرتے ہیں اور جسکو وہ اپنی اصطلاح میں توسیع زبان کہتے ہیں۔

اسکے علاوہ انگریزی قواعد پر عبور ہو جانے کی وجہ سے انگریزی داں حضرات یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اردو زبان کے بھی وہی قواعد ہیں جو انگریزی کے۔ چنانچہ اس زعم میں محاورے بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صیغوں کا غلط استعمال کرتے ہیں اور اپنی غلطی کو نہیں محسوس کر سکتے۔ مثلاً اردو کا محاورہ ہے "ہمارے دہاں ایسا ہوا۔" ایک انگریزی داں شخص یہ کہے گا کہ بولنے والا تو واحد ہے۔ اس لئے میرے لکھنا چاہیئے علاوہ بریں وہاں میں بُعد کے معنی ہیں۔ اسلیئے یہاں ہونا چاہیئے۔ اس لئے میرے یہاں زیادہ فصیح ہے۔ مگر یہ استدلال سراسر غلط ہے۔ ایک دوسرا اُردو کا محاورہ ہے "دیکھا نہ سنا" جسکے معنی ہیں "نہ دیکھا نہ سُنا" ایک انگریزی داں شخص یہ کہے گا چونکہ ابتدا میں علامت نفی نہیں ہے جیسے اس انگریزی فقرے (NEITHER HE SAW NOR DID HE HEAR) میں ہے۔ اس لئے اس کے معنی ہیں دیکھا مگر نہیں سُنا۔

اصلیت یہ ہے کہ انگریزی میں مہارت تامہ حاصل ہونے کے بعد زبان اُردو سے اس حد تک بیگانگی پیدا ہو جاتی ہے کہ سلاست زبان اور فصاحت تو درکنار اُردو کے معمولی معمولی جملے بھی لکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

غضب خدا کا اگر کسی انگریزی خوان ہندوستانی کے سامنے ہم Triangular field کی جگہ Three angular field استعمال کریں یا Biennial plant کی جگہ Two ennial plant - Biweekly کی جگہ "TWO WEEKLY" - Bicycle کی جگہ Two cycle Fortnightly کی جگہ Half monthly کہیں تو یہ غیر فصیح جملے اُس کے کانوں پر بہت زیادہ گراں ہوں گے اور اُس کے مذاق سلیم کو بہت سخت ٹھیس لگے گی مگر جس وقت سہ ماہی کی جگہ تماہی استعمال کیا جاتا ہے اور متعدد پرچوں اور رسالوں میں اُسکی مخالفت بھی کی جاتی ہے تو ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی - اس سے یہ ظاہر ہے کہ انگریزی محاورات اس طرح رگ و پے میں سرایت کر گئے ہیں کہ فصاحت کا احساس تک جاتا رہا اور مذاق سلیم بالکل مفقود ہو گیا - اردو زبان میں چھ ماہی صرف مردے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہاں تو ایک نیا لفظ تماہی غالباً اردو زبان کے مُردے کے لئے استعمال کیا گیا ہے میں نے لفظ مردہ کا استعمال خاصکر اس وجہ سے کیا ہے کہ اگر کسی شخص کو زبان اردو پر عبور ہو گا تو لفظ تماہی سنتے ہی فوراً اُس کا خیال مردے کی طرف منتقل ہو گا - کیونکہ چھ ماہی صرف مردے کے لئے استعمال ہوتا ہے - آپ ہی خود بتائیں اردو کی تماہی کے اور کیا معنی ہو سکتے ہیں - (باقی)

قاضی خورشید احمد - ایم - ایس - سی

موج تبسم کے بعد ہندوستان کے مایۂ ناز مزاح نگار ادیب

حضرت شوکت تھانوی

کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ گرانقدر مزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ

بحر تبسم

تیار ہو چکا ہے اور تکمیل کے بعد ۳۰ مئی کو ضرور روانہ کر دیا جائیگا جو حضرات بحر تبسم کی قیمت اب تک بھیج چکے ہیں یا جو ۲۵ مئی تک بھیج دینگے اُنکو معہ محصول قسم اول سنہری جلد صرف ؏ ۱۲ میں اور غیر مجلد ؏ معہ محصول ڈاک ملیگی - ورنہ عام قیمت قسم اول سنہری جلد معہ محصول ؏ ۶ قسم دوم غیر مجلد ؏ ۱۲ معہ محصول ڈاک - اگر آپنے دیر کی تو موج تبسم (پہلے مجموعہ) کی طرح ہم اس کی بھی تعمیل نہ کر سکیں گے -

پتہ :- منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

انٹرویو

گھبرایا ہوا نوجوان میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہی بولا کہ وہ روزنامہ ... کا نامہ نگار ہے اور میرے پاس انٹرویو کے لئے آیا ہے۔ میں نے متعجب ہوکر پوچھا۔ کیوں؟ جواب ملا: "انٹرویو کے لئے۔"

میں۔ اوہ، اچھا۔ اچھا ہاں۔

میری طبیعت گو صبح ہی سے کچھ مکدر سی تھی۔ تاہم میں کتابوں کی الماری کے پاس گیا۔ اور دس منٹ تک مختلف کتابیں اور ڈکشنریاں دیکھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ نوجوان نامہ نگار کے بغیر یہ لاینحل مسئلہ حل ہونے کا نہیں۔ چنانچہ میں نے عرض کیا کہ آپ انٹرویو کے ہجے کس طرح کریں گے۔

وہ (حیران ہوکر) ہجے؟ کس کے؟

میں۔ انٹرویو کے

وہ۔ آپ کو انٹرویو کے ہجوں کی کیا ضرورت لاحق ہوگئی

میں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ انٹرویو کے معنی کیا ہیں؟

وہ۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔ میں آپکو اسکے معنی تو بتا دونگا۔ لیکن ...... لیکن

میں۔ شکریہ۔ نوازش

وہ۔ الف نون زیر۔ اِن۔ ٹے رے۔ ٹر اِن ٹر ....

میں۔ اچھا تو انٹرویو میں گویا پہلے الف آتا ہے۔

وہ۔ یقیناً۔ کیوں؟

میں۔ لاحول ولا۔ بس اسی بات نے تو میرے دس منٹ لئے

وہ۔ لیکن یہ کیوں؟ تو کیا آپ الف کی بجائے اسے کسی اور حروف سے شروع کریں گے۔

میں۔ ہاں، یہی تو مجھے معلوم نہ تھا۔ اس لئے میں ڈکشنریوں کی طرف سے مایوس ہوکر تصاویر والی کتابیں دیکھ رہا تھا کہ شاید ان میں کہیں پتہ مل جائے لیکن میری کتابیں بڑے پرانے ایڈیشن کی ہیں۔ اغلباً نئے ایڈیشنوں میں انٹرویو کی تصویر ہوگی۔

وہ۔ (سراسیمہ ہوکر) میرے معزز بزرگ۔ انٹرویو کی تصویر آپ کو نئے ایڈیشنوں میں بھی نہیں ملسکتی۔ مگر مجھے معاف فرمائیں۔ میں دنیا میں کسی شخص کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتا۔ تاہم میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ اتنے قابل ادیب نہیں۔ جتنی آپ کی شہرت ہے۔ معاف فرمائیے۔ میں نے ابھی

تک کسی کی دل آزاری نہیں کی۔

میں۔ یقیناً نہیں۔ میرے متعلق یہی خیال ایسے احباب نے بھی ظاہر کیا ہے۔ جو کسی کی خوشامد نہیں کرتے اور جن کو دنیا کی کوئی چیز بھی خوشامد پر مائل نہیں کر سکتی۔ لہٰذا وہ سب میرے اس خصوصیت کے مداح ہیں

وہ۔ بالکل درست۔ ہاں تو اس انٹرویو کے متعلق یہ گذارش ہے کہ آج کل یہ دستور ہے کہ جو آدمی مشہور ہو جائے۔ اُس کے ساتھ انٹرویو کیا جاتا ہے۔

میں۔ خوب۔ میں نے اس کے متعلق آج تک کچھ بھی نہیں سنا تھا۔ یہ تو بڑی دلچسپ چیز ہوگی اچھا تو آپ انٹرویو کو کس چیز کیساتھ سرانجام دینگے۔

وہ۔ کس چیز کے ساتھ؟ یہ تو عجیب سوال ہے جناب بندہ۔ انٹرویو میرے اور آپ کے درمیان ہو گا اور وہ اس طرح کہ میں آپ سے سوالات کرتا جاؤں گا۔ اور آپ جوابات دیتے جائیں گے۔ چونکہ بہت سا وقت ضائع ہو چکا ہے۔ لہٰذا مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ سے چند ایسے سوالات کروں جو آپ کی زندگی کے پبلک اور خانگی پہلوؤں پر کچھ روشنی ڈالیں۔

میں۔ بڑی خوشی سے۔ بسم اللہ۔ بسم اللہ۔ لیکن ایک بات عرض کئے دیتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ چونکہ میرا حافظہ بہت زیادہ کمزور ہے۔ اس لئے آپ اس کا چنداں خیال نہ فرمائیں۔ میرا حافظہ عجیب و غریب ہے۔ یعنی یا تو اسے برسوں کی بات یاد رہتی ہے اور یا پرسوں کی بھی نہیں۔

وہ۔ خیر کچھ مضائقہ نہیں۔ آپ اپنی طرف سے ٹھیک ٹھیک جواب دینے کی کوشش کریں۔

میں۔ ضرور میں دل و جان سے صحیح اور درست جوابات دینے کی سعی کروں گا۔

وہ۔ اچھا تو اب آپ میرے سوالات کے جوابات دینے کے لئے تیار ہیں نا۔

میں۔ بالکل۔

وہ۔ آپ کی عمر کیا ہے؟

میں۔ ماہ جون میں اُنیس سال کا ہو جاؤں گا۔

وہ۔ (تعجب سے گھورتے ہوئے) اچھا۔ میں تو آپکو ۲۵، ۲۶ سال کا سمجھتا تھا۔ خیر آپکی پیدائش کس مقام پر ہوئی۔

میں۔ پشاور میں۔

وہ۔ آپ نے مضمون نگاری کب شروع کی۔

میں۔ ۱۸۹۵ء میں

وہ۔ ہیں۔ ۱۸۹۵ء میں؟ یہ کیسے ممکن ہے جب بقول آپ کے آپ صرف اُنیس سال کے ہیں۔

میں۔ میں خود نہیں جانتا۔ اور مجھے خود بھی یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے۔

وہ۔ خیر تو آپ خود بھی اسے محسوس کرتے ہیں اچھا تو آپ اب تک جن بڑے آدمیوں سے مل چکے ہیں۔ آپ کے خیال میں ان سب سے بڑا آدمی کون ہے؟

میں۔ سر سید علیہ الرحمۃ۔

وہ - تیز ہو کر (ناممکن) ایک اُنیس سالہ نوجوان بھلا سر سید سے کس طرح مل سکتا ہے۔

میں - اچھا تو جب آپ میرے متعلق مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ تو پھر ان سوالات کی کوئی ضرورت نہیں۔

وہ - خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ اچھا تو آپ سر سید اعظم سے کہاں ملے؟

میں - مجھے ایک دن اُن کے جنازے پر جانے کا اتفاق ہوا۔ اور اُنھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ براہِ کرم یہاں شور نہ کرو۔

وہ - لاحول ولا۔ اگر آپ ان کے جنازے پر پہونچے تو وہ یقیناً فوت ہو چکے ہوں گے۔ اور اگر وہ وفات پا چکے تھے تو ایک مردہ آپ سے یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ برائے مہربانی یہاں شور نہ کرو۔

میں - میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن چونکہ وہ بہت بڑے آدمی تھے۔ اس لئے ممکن ہے یہ بھی اُن کی خصوصیت ہو۔

وہ - معاف فرمائیے۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا۔ آپ فرماتے ہیں کہ انھوں نے آپ سے بات بھی کی اور یہ کہ ان کا انتقال بھی ہو چکا تھا۔

میں - میں نے ان کے انتقال کے متعلق تو کچھ بھی نہیں کہا۔

وہ - تو کیا وہ مر نہیں چکے تھے۔

میں - بعض آدمی کہتے تھے کہ وہ مر چکے ہیں۔ اور بعض کہتے تھے کہ نہیں وہ زندہ ہیں۔

وہ - لیکن آخر آپکا کیا خیال تھا۔

میں - میرا کچھ بھی خیال نہ تھا۔ کیونکہ وہ میرا جنازہ تو تھا ہی نہیں۔ کہ میں اس امر کا خاص خیال رکھتا۔

وہ - ہنستے ہوئے - یہ تو آپ نے ایک ہی کہی۔ خیر تو ہم اس مسئلہ کو یہیں چھوڑتے ہیں۔ اچھا یہ تو فرمائیے کہ آپ کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟

میں - بروز پیر ۳۱ر اکتوبر سنہ ۱۷۹۳ء

وہ (نہایت غصہ سے) غیر ممکن - غیر ممکن - اس حساب سے تو آپ ڈیڑھ سو سال کے ہوئے بھلا آپ اس کو کیسے ثابت کر سکتے ہیں۔

میں - میں اس کو ثابت کرنا ہی نہیں چاہتا۔ مجھے اس کے ثابت کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔

وہ - لیکن آپ نے خود ہی تو پہلے کہا تھا کہ آپ اُنیس سال کے ہیں۔ اور اب آپ نے اپنے تئیں ڈیڑھ سو برس کا ظاہر کیا۔ یہ تو بڑا فرق ہے۔

میں (کرسی سے اُچھل کر) اخاہ۔ تو آپ نے یہ فرق بھی محسوس کیا (زور سے ہاتھ ملاتے ہوئے) بسا اوقات مجھے خود بھی اس امر کا خیال آیا۔ لیکن بخدا میں نے فرق کبھی محسوس نہیں کیا۔ ماشاءاللہ آپ بہت ذہین واقع ہوئے ہیں۔

وہ - (جھینپ کر) اس اعزاز کے لئے شکریہ۔ اچھا تو آپ کے کوئی بھائی بہن بھی ہے یا نہیں۔

میں - میں ...... میں ...... خیال کرتا ہوں ...... ہاں ...... نہیں ...... مگر، مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔

وہ - نہیں - اس سے زیادہ مضحکہ انگیز جواب تو
میں نے عمر بھر نہیں سُنا -
میں - یہ کیوں - آخر اس میں کیا غیر معمولی بات ہے -
وہ - لیکن میں اسے مضحکہ انگیز کیوں نہ کہوں - کیا
یہ دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر آپ کے بھائی کی نہیں
میں - واہ - وا - شاباش - ہاں - ہاں - اب آپ نے
مجھے یاد دلایا - فی الحقیقت یہ میرا بھائی تھا - یہ
عبدالرحمٰن کی تصویر ہے - ہم اسے "مہابجی" کہا
کرتے تھے - آہ - پیارا مہابجی ....
وہ - کیوں - تو کیا وہ فوت ہو چکے ہیں -
میں - آہ میں یہی فرض کرتا ہوں - میں یقیناً کچھ بھی
نہیں کہہ سکتا - یہ بھی ایک عجیب راز ہے -
وہ - واقعی بڑے افسوس کی بات ہے - یہ غریب
کہیں غائب ہو چکا ہوگا -
میں - ہاں - اب تو غائب ہی سمجھو - کیونکہ ہم نے
خود ہی اسے دفن کر دیا تھا -
وہ - دفن - دفن - تو کیا زندہ ہی کو دفن کر دیا تھا -
میں - نہیں - نہیں - وہ کافی مر چکا تھا -
وہ - جھنجلا کر - میں اعتراف کرتا ہوں کہ آپ کی
گفتگو کم از کم میری سمجھ سے تو بہت بالا ہے - بندہ
خدا - جب وہ مر چکا تھا - اور آپ نے مردہ کو دفن
کیا تو ....
میں - نہیں - نہیں - ہمارا خیال تھا کہ وہ مر چکا ہے -
وہ - اچھا - اب میں سمجھا - تو دفن کرتے وقت جی
اُٹھا ہوگا -

میں - تو آیئے شرط بد لیجئے کہ وہ دفن کرتے وقت
نہیں جیا -
وہ - لاحول ولا - ارے میاں - آخر آپ کا مطلب
کیا ہے - جب آدمی مر گیا - اور اُسے دفن کر دیا
گیا تو اس میں "عجیب راز" کی کونسی بات ہوئی ؟
میں - آہ ! یہی تو راز ہے - میں اور مہابجی توام تھے
جب ہم دو ہفتے کے تھے - تو ایک ٹب میں نہانے لگے
ہم میں سے ایک ڈوب گیا - لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ
کون ؟ کوئی کہتا تھا کہ مہابجی ڈوبا - اور کوئی میرا
ڈوبنا ظاہر کرتا تھا -
وہ - (ہنس کر) واقعی یہ تو بڑے عجیب راز کی بات
ہے - اچھا تو آپ کے خیال میں کون ڈوبا تھا -
میں - یہ تو خدا ہی کو معلوم ہوگا - لیکن واقعات کہتے
ہیں - کہ میں - سنیئے میں آج آپ پر وہ راز ظاہر
کرتا ہوں - جو اس سے پہلے کسی پر ظاہر نہیں کیا
گیا - اور اسی راز نے میری زندگی کو غم و آلام سے
لبریز کر رکھا ہے - ہم دونوں میں سے ایک کی دہنی
کہنی کے نیچے ایک بڑا تِل تھا اور وہی تِل والا بچہ
ڈوبا تھا (کہنی ننگی کر کے) اور یہ دیکھیئے - وہ تِل یہ ہے -
آہ - مہابجی -
وہ - بہت خوب - لیکن مجھے تو اب بھی اس میں راز
کی کوئی بات نظر نہیں آتی -
میں - تو معلوم ہوا کہ آپ بھی میرے والدین کی طرح
اندھے ہیں - کیونکہ اگر وہ اندھے نہ ہوتے تو میری
جگہ مہابجی کو دفن نہ کرتے - اب خدا کے لئے یہ راز

اثر ظاہر نہ کرنا۔ کیونکہ کہیں تلافیٔ مافات کے لئے اُسے نکال کر مجھے نہ دفنا دیں۔

وہ۔ میں آپ کا بہت زیادہ ممنون ہوں۔ مجھے اس انٹرویو میں کافی سے زیادہ دلچسپ مواد مل گیا ہے۔ سب سے زیادہ دلچسپ تذکرہ سرسید علیہ الرحمۃ کے جنازے کا تھا۔ ہاں تو کیا آپ یہ بتلانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ سرسید مرحوم کو سب سے بڑا آدمی ماننے کے لئے آپ کے پاس کیا اسباب ہیں۔

میں۔ اوہ۔ یہ تو ایک معمولی سی بات ہے جب غسل و کفن کے بعد جنازہ باہر جانے کے لئے تیار ہوا۔ تو سرسید علیہ الرحمۃ نے اُٹھ کر یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ کالج کی عمارات کا ایک آخری نظارہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ سروقد اُٹھ کھڑے ہوئے اور عمارات کو دیر تک بہت غور سے دیکھتے رہے۔

نوجوان نامہ نگار مجھ پر دہشت خیز نگاہیں ڈالتا ہوا اٹھا اور بغیر رسمی سلام کے جلدی جلدی دروازہ کھول کر کمرہ سے باہر نکل گیا۔

"شبلی افغانی"

بہ ادنیٰ تصرف مارک ٹوین

نگارستان

حضرت نیاز کے اور متعدد مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبولیت حاصل کیا اُسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت (عہ/)

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ۔ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ علاوہ محصول ۱۰/

صحابیات

جس میں عہد سعادت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشا میں لکھا ہے۔ قیمت علاوہ محصول (عہ/)

مینیجر "نگار" لکھنؤ

کوئی کہانی سُناؤ

بچہ جب بولنے کے قابل ہوتا ہے تو کہتا ہے:۔ "کوئی کہانی سُناؤ"۔

دادی شروع کرتی ہے:۔ "ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شہزادہ تھا اور وزیر زادہ اسکا دوست تھا" لیکن اس شغلہ کو اسکول ماسٹر بند کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔ "تین کا چوگنا بارہ ہوتے ہیں اسے سیکھو، کیونکہ یہ ایک واقعہ ہے، حقیقت ہے، اور شہزادہ کی کہانی تو جھوٹی کہانی ہے"

لیکن یہ تعلیم بچہ کو متاثر نہیں کرتی، کیونکہ اُسکی رُوح تو اسی غیر دریافت شدہ سرزمین کی سیر کر رہی ہے۔ جہاں شاہزادہ نے دیو کو مارا تھا ـــ اور ـــ ریاضی میں اتنی پرواز کہاں کہ وہاں تک اُڑ کر پہونچ سکے۔

بچہ کے والدین سر کو جنبش دیکر افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ:۔ "یہ بالکل تباہ ہو رہا ہے۔ اب سوائے زدوکوب کے کوئی چارہ نہیں"۔

اسکول ماسٹر نے دادی کی کہانیاں تو بند کر دیں، لیکن وہ اس سے بیخبر ہے کہ کہانیوں کا سلسلہ تو بدستور جاری ہے۔ کہنے والے کہے جا رہے ہیں کہ:۔ "کہانیاں تاریخ میں کہیں نہیں پائی جاتیں۔ اسلئے جھوٹی ہیں"۔ اور ابتدائی تعلیم سے لیکر انتہائی تعلیم تک بچہ کی تربیت ذہن و دماغ پر وقت صرف کیا جاتا ہے ـــ مگر ـــ بچہ کا یہ مطالبہ کہ:۔ "کوئی کہانی سناؤ" ہنوز جاری ہے۔

تمام روئے زمین پر، ہر جگہ، ہر گھر میں کہیں زبانی اور کہیں تحریری: کہانیوں پر کہانیاں طیار ہوتی جا رہی ہیں اور انسانی میراث میں سب سے زیادہ جو چیز ملتی ہے: وہ یہی کہانیاں ہیں۔

لوگ یہ نہیں سوچتے کہ کہانیاں بنانا تو خود خدا کا بہترین مشغلہ ہے۔ اس لئے پہلے اس سے یہ عادت ترک کراؤ، پھر انسان سے کہنا۔

ایک بار خالقِ اعظم نے، اپنے مصروف و منہمک دارالتجربہ میں عنصر کی طیاری شروع کی۔ کائنات اُسوقت صرف دُھواں ہی دُھواں تھی۔ چٹانیں، معدنیات تہ بہ تہ بچھائی جا رہی تھیں اور اُسوقت اس خالقِ اعظم کی یہ حالت تھی کہ اگر تم دیکھتے تو کہتے کہ واقعی آج اس پر طفلانہ مزاجی بالکل نہیں

پائی جاتی - پھر جو کچھ اس نے کہا وہ وہ تھا جسے "مادہ اور مادی" کہتے ہیں -

پھر آغاز حیات کا زمانہ آیا - گھاس اُگی ، درختوں کے کلّے پھوٹے ، چڑیاں ، چوپائے اور مچھلیاں نمودار ہوئیں ، کسی نے گھونسلے بنائے ، کوئی پانی کی تہ میں چلا گیا اور کسی نے منتشر ہو کر دنیا میں اپنی نسل پھیلانی شروع کی -

عُمریں گذر گئیں یہانتک کہ آخرکار ایک دن اُس نے آدمی بنایا - اس وقت تک خدا کچھ تو سائنس داں تھا اور کچھ انجنیر - لیکن اب وہ ایک "ادبی صنّاع" ہو گیا -

اب اس نے انسانی روح کی تہوں کو کہانیوں کے ذریعہ سے کھولنا شروع کیا ، جانور سوتے تھے ، کھاتے تھے ، بچے پیدا کرتے تھے ، لیکن انسان جن حالات سے گذر رہا تھا وہ کیسر افسانہ خیز تھے - جذبات کا تصادم - فرد و جماعت کی گتھیاں - جسم و روح کی جنگ ــــ دریا نام ہے پانی کے بہاؤ کا - لیکن انسان سیلاب ہے کہانیوں کا -

جب دو آدمی ملتے ہیں تو سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے :- " کیا خبر ہے - پھر کیا ہوا ؟ " ان سوالوں کے جوابات کا ایک جال ساری دنیا پر بچھا ہوا ہے - یہی ہے زندگی کا افسانہ اور یہی ہے انسان کی تاریخ -

انسان نمونہ ہے آرٹ کا - اس کی تعمیر میں نہ ترکیب مکانکی پر زور دیا گیا ہے نہ اخلاق پر ، بلکہ صرف تخیل و تخئیل پر - اس کے ہوا خواہ اس صداقت پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں ، لیکن صداقت اس پردہ کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے -

آخرکار انسان کے معلم و رہبر اخلاق اور انسان کی افسانہ پسندی کے درمیان مصالحت کی کوشش کرتے ہیں - لیکن یہ دونوں ایک دوسرے سے ملکر نہیں رہ سکتے اور نتیجہ یہ ہے کہ خرافات کا ایک ذخیرہ بے پایاں ڈھیر ہوتا جا رہا ہے -

(ٹگور)

جذبات بھاشا

ہندی شاعری کی حلاوت و شیرینی تمام شاعری میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے - جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے انکی ایسی نظیر و تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے - قیمت علاوہ محصول (۱۲ر) "مینیجر نگار" لکھنؤ

باب الاستفسار

مسیح علم و تحقیق کی روشنی میں

بہ سلسلۂ سابق

اوسریز اور آئیسس کے متعلق روایت یہ ہے کہ سورج دیوتا رع کے نطفہ اور آسمان کی دیوی نوط کے بطن سے ایک دیوتا پیدا ہوا جس کا نام اوسیریز خداوند نور تھا۔ ایک دن نوط دیوی دیوتاؤں کے ایلچی توث (THOTH) سے اختلاط کر بیٹھی جس سے ایک حسین و جمیل دختر آئیسس (ISIS) پیدا ہوئی۔ کچھ دنوں بعد آسمان کی یہ شوقین دیوی سیب (SEB) دیوتا یعنی زحل سے وابستہ ہو گئی جس کے نطفہ سے سیت (SET) یعنی خداوند ظلمت پیدا ہوا۔ اوسیریز اور آئیسس دونوں ایک دوسرے کے دلدادہ تھے جس سے سیت سخت برافروختہ ہوا اور اس نے اوسیریز کو دغا سے قید کر لیا اور ایک سربمہر صندوق میں رکھکر دریا میں پھنکوا دیا۔[1] فرقت کی ماری حرمان نصیب آئیسس اپنے معشوق اوسیریز کو ہر طرف ڈھونڈھتی پھرتی تھی کچھ عرصہ بعد اسے معلوم ہوا کہ لاش کا صندوق دریائے نیل میں بہتا ہوا سمندر میں چلا گیا اور وہاں موجوں نے تھپیڑے دیکر ساحل شام پر بمقام بائبلوس پہونچا دیا ہے۔ صندوق جا کر ایک درخت میں لگا جو اس کی برکت سے اسقدر پھلا پھولا اور پھیلا کہ وہاں کے بادشاہ نے اسے پسند کر کے کٹوا دیا اور اپنے محل میں ستون بنوا کر نصب کرا لیا۔ آئیسس دیوی لاش کی تلاش میں بائبلوس پہونچی اور وہاں سے بدقت تمام لاش کا صندوق اور ستون لے کر مصر واپس آئی۔ اسطرح مصر اور بائبلوس کا تعلق پیدا ہوا۔

ایک روایت پلوٹارک نے یہ بھی بیان کی ہے کہ ایک روز آئیسس دیوی اوسیریز کی لاش پر لیٹ گئی جس سے ہوروس (HORUS) پیدا ہوا۔ ایک دن آئیسس اپنے لڑکے ہوروس کو تلاش کرنے گئی تو سیت نے اسے لاش کا

---

[1] غالباً یہیں سے موسیٰ کو دریائے نیل میں پھینکے جانے کی روایت لی گئی ہے۔

پتہ چلگیا تھا لاش چرالی تھی اور اس کے چودہ ٹکڑے کرکے سب کو ادھر ادھر پھینکوا دیا۔ آئسیس نے لاش کے ٹکڑے بڑی محنت سے تلاش کیے اور سب سے بڑے دیوتا رع نے رحم کھاکر اوسیریز کو زندہ کردیا اور اسے پاتال کا بادشاہ بنا دیا۔ اسطرح مصری دیوتا اوسیریز مرکر زندہ ہوا۔

یہ روایت نہ صرف ہر مصری بچہ کی زبان پر جاری تھی بلکہ ہر سال نہایت شان و شوکت کے ساتھ اسکا ڈرامہ کھیلا جاتا تھا۔ ماہ نومبر میں جو مصر میں فصل ربیع کی تخم ریزی کا وقت ہوتا ہے۔ بمقام سائیس (SAIS) رسم ادا ہوتی تھی۔ اول تو چار دن تک اوسیریز کی موت پر خوب ماتم کیا جاتا تھا پھر تین دن بعد پجاری لوگ ایک طلائی صندوق لے کر دریا پر جاتے صندوق میں پانی ڈالتے اور پھر نعرہ ہائے مسرت و شادمانی بلند ہوتے کہ اوسیریز مل گیا ہے۔ بہر حال اس کے معنی خواہ کچھ ہوں لیکن بظاہر ہے کہ اہل مصر زمانہ لامعلوم سے ایک مصیبت زدہ، مقتول اور پھر زندہ ہونے والے دیوتا سے بخوبی واقف تھے۔

ایران قدیم ہم نے ابھی تک ایران کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ یہی وہ سلطنت تھی جو بابل۔ آشوریہ اور مصر کے زوال کے بعد اس وقت کی تمام متمدن دنیا پر غالب آگئی تھی۔ اور اس کا مذہب مدائن (PERSIPOLIS) سے لیکر جزائر برطانیہ تک اسوقت پھیلا ہوا تھا جبکہ دین عیسوی نہایت ہی کمزور و ضعیف حالت میں پایا جاتا تھا۔

ان دنوں ایران کا مذہب مترائیت (MITHRAISM) تھا جو دین عیسوی سے بہت پہلے کا مذہب تھا اس مذہب کا عقیدہ یہ تھا کہ گناہوں سے نجات دلانیوالی ایک ہستی ہے جو بغیر باپ کے کنواری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی اس دیوتا کی ولادت موسم کے وسط میں (یعنی دسمبر کے آخری ہفتہ میں پیدائش یسوع کی طرح) ایک غار کے اندر ہوئی۔ مترائیت کے مندر تاریک لہذا نوگوں سے معمور رہتے۔ جہاں ہر سال معتقدین کے سامنے یہی تقریب ہوا کرتی تھی یعنی دین مسیحی سے صدیوں پیشتر ہر سال یہ ڈرامہ ہوتا تھا کہ مترا (MTHRA) دیوتا نے جان دیکر لوگوں کے گناہوں کا کفارہ دیا اور پھر جی اٹھا (یہی عقیدہ عیسائیوں کا بھی ہے) اس کی ہر سال خوشیاں منائی جاتی تھیں۔

پادری فرمنگس میٹرنس (   ) نے اپنی کتاب "اغلاط مذاہب باطلہ" (ERRORS OF PROFANE RELIGION) کے باب ۲۳ میں اس تقریب کا حال اسطرح بیان کیا ہے: "ماہ مارچ میں ایک خاص رات مقرر کرکے ایک بت ارتھی پر رکھا جاتا ہے۔ جسکا مذہبی بھجنوں کیساتھ ماتم کرتے ہیں۔ جب اس مصنوعی نوحہ زاری اور ماتم سے انکا دل بھر جاتا ہے تو پھر ایک روشنی اندر لائی جاتی ہے۔ اس کے بعد تمام ماتم گساروں کے منہ پر ایک پجاری تیل چپڑتا ہے اور آہستہ آہستہ یوں کہتا جاتا ہے:۔

"اے مرکر زندہ ہو جانیوالے دیوتا کے پرستارو! خوشیاں مناؤ کیونکہ اب تمھیں تمھارے غم و الم سے نجات مل گئی ہے"

یونان قدیم قدیم یونانیوں میں بھی اس قسم کی بہت سی روایات پائی جاتی تھیں۔

قدیم یونانیوں کا خدائے عظیم ذیوس (ZEUS) تھا اور جس طرح ہندوستان کا مہادیو کیلاش پربت پر رہتا ہے۔ اسی طرح قدیم یونان کا یہ خدا کوہ اولمپس پر رہتا تھا۔ ذیوس کی بیوی کا نام ہیرا دیوی تھا۔ لیکن اس کی ایک اور بھی محبوبہ تھی جس کا نام دمیتر (DEMETER) (یعنی دیوتاؤں کی ماتا دیو ماتری)۔ دمیتر کے بطن سے ایک حسین و جمیل لڑکی پرسیفونی (PERSEPHONE) پیدا ہوئی جس کا دوسرا نام کوڑے یا کوڑا (KORA) بھی تھا جس کے معنی "لڑکی" کے ہیں (پنجابی زبان میں لڑکی کو کوڑی کڑی۔ یا کڑیا کہنا کہیں اسی واقعہ سے تو تعلق نہیں رکھتا) پاتال کا راجہ پلوٹو (PLUTO) یعنی جمراج اس لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ سنگدل اور رحیم و کریم ذیوس کو اس کی حالت پر رحم آیا اسلیے اس نے پلوٹو کو صلاح دی کہ چونکہ لڑکی کی ماں دمیتر دیوی اپنی بیٹی کو پاتال جانیکی ہرگز اجازت نہ دیگی اس لیے بہتر ہوگا کہ کسی روز جب تمھاری معشوقہ پرسیفونی چمنستان خلد میں سیر کو نکلے تو تم اسے اڑا لے جاؤ۔ پلوٹو نے ایسا ہی کیا لڑکی کی ماں دمیتر دیوی کو جب صاحبزادی کی گمشدگی کا حال معلوم ہوا تو وہ اس کی تلاش میں رو تی اور دنیا بھر کی خاک چھانتی پھری (اسی طرح آئیسس دیوی اوسیرز کو، اشتار دیوی تموز دیوتا کو اور یہودی عورتیں یسوع ناصری کو ڈھونڈتی پھرتی تھیں) بالآخر اسے معلوم ہو گیا کہ پرسیفونی کہاں ہے۔ اسکے بعد اس نے ذیوس کی منت سماجت کی کہ اس کی لڑکی واپس دلائی جائے۔ ذیوس نے رحم کھا کر پلوٹو کو حکم دیا کہ وہ پرسیفونی کو واپس کر دے۔ پلوٹو نے بادل ناخواستہ منظور کر لیا لیکن جانے کی اجازت دینے سے پہلے پلوٹو نے پرسیفونی کو ترغیب دی کہ وہ ایک انار کھالے (یونانی روایات کے مطابق انار کھانے کا مطلب یہ تھا کہ پرسیفونی انار کھا کر پاتال کی مستقل باشندہ ہو جائے)۔ بہرحال آپس میں مفاہمت ہو گئی کہ پرسیفونی چار ماہ تک اپنے عاشق پلوٹو کے پاس پاتال میں گذارے۔ اور بقیہ آٹھ ماہ اپنی والدہ دمیتر دیوی کے پاس رہے۔

قدیم یونان کی دوسری روایت اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ وہ اسطرح ہے کہ خداوند ذیوس (آسمانی خدا یا باپ) کی طبیعت ایک حسین و جمیل دوشیزہ لڑکی سمیلہ (SEMELE) پر مائل ہو گئی۔ دونوں میں اختلاط ہوا تو اس کنواری ماں کے پیٹ سے ایک لڑکا (دیوتا) پیدا ہوا جس کا نام ڈیونی سوس (DIONUSUS) تھا۔ لیکن ذیوس کی بیوی ہیرا دیوی کو جب اپنے شوہر سمیلہ کی عشقبازیوں اور استقرار حمل کا حال معلوم ہوا تو سخت برافروختہ ہوئی۔ اور اس نے چاہا کہ اس بچہ کو ضائع کر دے۔ اس لیے کنواری ماں سمیلہ کو بحالت سفر دردزہ شروع ہوا تو اسے ایک غار کے اندر چھپکر بچہ جننا پڑا۔ اور اس کے بعد بھی ہیرا کے خوف سے اس نوزائیدہ بچے کو خفیہ کسی دوسری جگہ بھیجدیا (آجکل یہی صورت ولادت یسوع ناصری کی بیان کی جاتی ہے۔) مگر ہیرا دیوی نے دوسرے طریقہ سے انتقام لیا۔ یعنی وہ جوش سے بھری ہوئی بحالت جنون عین عالم شباب میں اس لڑکے کے پاس پہنچ گئی اور بس......! اس کے بعد وہ نوجوان دنیا بھر میں گھومتا پھرا (واضح ہو کہ مسیح کے معنی بھی زمین کی

پیدائش کو نہ والاہیں ۔) وہ صاحب معجزہ ہوگیا ۔ دریاؤں اور جھیلوں کو پیدل عبور کر جاتا تھا ۔ اور اس کے پاؤں خشک رہتے تھے ۔ اسی قسم کے اور معجزات بھی وہ دکھاتا تھا (یہی باتیں یسوع سے منسوب کی جاتی ہیں ۔)
ڈیونی سوس دیوتا دو گونہ خصوصیات کا مالک تھا ایک تو وہ ہر جگہ تہذیب تمدن پھیلاتا تھا ۔ دوسرے جہاں جہاں وہ پہونچتا تھا وہاں شراب کباب اور سیہ مستیوں کا دور دورہ شروع ہو جاتا تھا ۔ (یسوع کی امت بھی آجکل یہی فرض ادا کر رہی ہے)

اس ڈیونی سوس دیوتا کا کیا حشر ہوا اسکی نسبت دو روایتیں بیان کی جاتی ہیں ۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ پاتال میں اترا اور وہاں سے اپنی ماں سمیلہ کو نکال لایا ۔ اور پھر اسے ساتھ لے کر آسمان پر چڑھ گیا دوسرے روایت یہ ہے کہ اسے ٹائٹن (TITON) لوگوں نے پارہ پارہ کر دیا تھا ۔ لیکن اسے پھر دیوتاؤں نے زندہ کر دیا اور وہ آسمان پر چلا گیا (یسوع کے متعلق بھی یہی عقیدہ ہے)
جب ڈیونی سوس دیوتا کی ولادت کا تہوار منایا جاتا تھا تو اسے ایک خوبصورت اور پیارے بچے کی صورت میں دکھایا جاتا تھا ۔ اور اس کی ماں سمیلہ بھی اس کے پاس ہوتی تھی (رومن کیتھولک گرجاؤں میں بھی کنواری مریم اور مسیح بچے کی ایسی ہی خوبصورت تصویریں ہوتی ہیں ۔)
یونان قدیم کی تیسری دلچسپ کہانی ہرقلیس (HERCULUS) سے یسوع کے پیدا ہونے اور آسمان پر چڑھنے کے قصہ کی پوری وضاحت ہوتی ہے ۔
ہرقلیس بھی بغیر باپ کے کنواری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا جس کا نام القمینہ (ALCEMENE) تھا جس کی ہر چند شادی ہو چکی تھی لیکن کوئی منت مان لینے کی وجہ سے وہ ہنوز اپنے شوہر کے پاس نہیں گئی تھی (بعینہ یہی حالت یسوع کی ماں مریم کی تھی وہ بھی یوسف نجار سے منسوب ہو چکی تھی لیکن منت مان لینے کی وجہ سے بیت المقدس کی خدمت کیا کرتی تھی اور ابھی تک سسرال نہیں گئی تھی) بہر حال مسماۃ القمینہ سے حالت دوشیزگی میں خداوند ذیوس نے ملاقات کی ۔ یا یوں سمجھیے کہ قادر مطلق خدا کی قدرت نے اس دوشیزہ عورت پر اپنا پرتو ڈالا اور حمل ٹھہر گیا ۔ (بالکل یہی فسانہ ولادت یسوع کے متعلق بیان کیا جاتا ہے) ذیوس کی بیوی ہیرا کو جب یہ حال معلوم ہوا تو وہ سخت ناراض ہوئی اور اس نے ارادہ کیا کہ اس بچے کو قتل کر ڈالے ۔ اس لیے القمینہ نے کسی پوشیدہ جگہ جا کر وہ بچہ جنا اور اسے چھپا دیا ۔ (یسوع ناصری کی ولادت بھی اسی طرح خفیہ طور پر ایک غار کے اندر ہونا بیان کی جاتی ہے) ذیوس نے اپنی بیوی ہیرا کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیا ۔ اور اس نے اس شرط پر کہ اگر وہ لڑکا جوان ہو کر اس کی بارہ شرطیں پوری کر دیگا تو وہ اس کی جان نہیں لے گی مفاہمت کر لی ۔ اس کے بعد ہفتخوان رستم و اسفندیار کی طرح ہرقلیس نے بعض کارنامہائے

عظیم انجام دیے جن سے ہم کو کوئی تعلق نہیں لیکن ہم کو ہرقلیس کے انجام سے خاص تعلق ہے یعنی یہ کہ اسکی بیوی نے اسے زہر دیدیا - ہرقلیس نے ایک بڑی چتا بنائی - اور اسمیں بیٹھ کر ایک چرواہے سے کہا کہ وہ آگ لگادے - اس کے بعد آسمان سے ایک ابر اترا اور ہرقلیس کے شاگردوں نے دیکھا کہ وہ اس ابر میں بیٹھ کر آسمان پر چڑھ گیا -

اسی طرح صدیوں بعد فلسطین میں بنی اسرائیل کی ایک کنواری لڑکی کے بطن سے خفیہ طور پر غار کے اندر ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے - جو بہت سے معجزہ دکھاتا ہے زہر دینے کے بجائے اسے صلیب دیجاتی ہے - وہ چتا پر بیٹھنے کے بجائے ایک پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتا ہے جہاں ایک لکۂ ابر نمودار ہوتا ہے اور اسے اٹھا لے جاتا ہے - اور وہ آسمان پر غائب ہوجاتا ہے (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الاعمال جلد نمبر ۱ باب نمبر ۹) یسوع ناصری کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کردیا کرتا تھا - لیکن حکیم اسقلیبوس (یونانی) نے اتنے مردے زندہ کردیے تھے کہ خداوند ذیوس نے اس کو اس خیال سے مار ڈالا کہ کہیں تمام فانی انسان موت سے نہ بچ جائیں - اس کے بعد ذیوس نے اسقلیبوس کو پھر زندہ کردیا اور دیوتاؤں میں رہنے کے لیے اسے آسمان پر اٹھا لے گیا - (یسوع ناصری کا قصہ بھی بالکل ویسا ہی ہے -)

الغرض جس دنیا میں مسیحیت نے جنم لیا اسمیں کوئی قوم ایسی نہ تھی جس کے یہاں کسی دیوتا کی پراسرار ولادت افسوسناک موت، احیاء ثانیہ و رفع الی السماء کا قصہ موجود نہو - اور یونانیوں میں ہرقلیس کا قصہ بچہ بچہ کی زبان پر تھا - الغرض دنیا کی حالت یہ تھی کہ دفعتاً ایک جوشیلا اور زمانہ شناس یہودی مسمی پولوس ساکن شہر طرسوس اٹھا اور اس نے اس سے فائدہ اٹھایا - وہ یونانیوں سے کہتا ہے کہ ایک خدا کا بیٹا - کنواری لڑکی کے پیٹ سے پراسرار طور پر پیدا ہونیوالا خدا، چند سال ہوئے مسلک یہودیہ میں ظہور پذیر ہوا - اس نے محیر العقل معجزے دکھائے - لوگوں نے اسے صلیب دیکر مار ڈالا - مگر وہ مر کر پھر زندہ ہوگیا - اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر سے لکۂ ابر میں بیٹھ کر اپنے باپ کے پاس آسمان پر چلا گیا - یونانیوں کے نزدیک یہ کوئی نئی بات نہ تھی - انھوں نے ہرقلیس کی طرح اس افسانہ کو بھی سنا اور قبول کرلیا

یسوع کی طرح سے بہت سے دیوتا کنواریوں کے پیٹ سے پراسرار طور پر غاروں میں پیدا ہوچکے تھے - جس طرح یسوع ناصری پانی پر چلتے تھے اور ایک مرتبہ سواری کے لیے دو گدھے بھی طلب کیے تھے - اسی طرح صدیوں پیشتر یونانیوں کا دیوتا دیونی سوس پانی پر چلتا تھا - اور اس نے بھی ایک مرتبہ دریا کو عبور کرتے ہوئے دو گدھوں میں سے ایک طلب کیا تھا جو اسے سوار کرکے خشکی کی طرح

دریا کو عبور کر لیا تھا۔

یسوع کے احیار ثانیہ کی کہانی بھی دیگر ہمسایہ مذاہب سے لے گئی ہے جس طرح ان کے دیوتا پاتال میں اتر گئے تھے اسی طرح یسوع بھی تین روز تک قبر میں رہے جس طرح ان دیوتاؤں کی موت پر گریہ وزاری کی گئی اسیطرح یسوع کی موت پر عورتوں نے ماتم کیا اب رہا پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنا۔ بادل میں سوار ہونا اور آسمان پر چلا جانا سو یہ قصہ لفظ بلفظ ہرقلیس یونانی کی روایات سے لیا گیا ہے

مر کر زندہ ہونیکا اصلی مطلب اب تک جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے ناظرین کرام کو بخوبی معلوم ہو گیا ہو گا کہ جس ملک میں بھی دین عیسوی پہنچا وہاں کسی کے مر کر زندہ ہونیکا عقیدہ ایک عام بات تھی مر کر زندہ ہونیوالا عموماً کوئی دیوتا ہوتا تھا۔ تمام سرزمین عراق میں کلدانیوں کے شہر اور سے لیکر یروشلم تک اس دیوتا کا نام تموز تھا۔ فلسطین کے شمالی علاقہ اور اس سے بھی شمالی علاقوں میں اس دیوتا کو آتیس کہتے تھے۔ ایشیائے کوچک اور تمام فینیقی دنیا میں اس دیوتا کا نام ایڈونیس تھا اور اور ایرانی دنیا میں بھی دیوتا مترا کہلاتا تھا۔ اور ملک مصر میں اس دیوتا کو اوسیریز کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اسکا حریف سیت تھا جسے لوگ ملک الظلمات اور خداوند شر کہتے تھے۔

دیوتاؤں کے مر کر دوبارہ زندہ ہونیکے متعلق جسقدر روایات اور خرافیات ہم نے درج کئے ہیں وہ دراصل تمثیلی قصے ہیں۔ جس کا اصلی مطلب نور و ظلمت اور خیر و شر کی ابدی جنگ ہے۔ جو دیوتا ہر سال مر کر زندہ ہوتا تھا وہ دراصل سورج ہے۔ جو موسم سرما میں مرجاتا ہے۔ یعنی خط استوا سے جانب جنوب یا پاتال کو چلا جاتا ہے۔ اور پھر وہی دیوتا فصل بہار میں زندہ ہو جاتا ہے یعنی آفتاب خط استوا سے جانب شمال رجوع کرتا ہے۔ حیات و ممات کا دوسرا مطلب زمین کی قوت نمو کا سالانہ مرنا اور فصل بہار میں پھر عود کر آنا ہے۔

اسوقت ہمارے سامنے دو باتیں زیر غور ہیں یعنی آفتاب کا عروج و زوال اور اس کے ساتھ قوت نمو کی کمی زیادتی۔ بعض اقوام پر ان دونوں میں سے ایک نے بمقابلہ دوسری کے زیادہ اثر کیا مثلاً ایرانی دیوتا مترا کی موت و حیات ثانیہ صاف طور پر "شمسی روایت" ہے اور دیمیتر اور اس کی بیٹی کی کہانی صاف طور پر زمین کی قوت نمو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسی طرح تموز۔ قابیلہ۔ آتیس کی روایات بھی صاف ہیں اوسیریز مصری خود سورج دیوتا تھا۔ اب غور طلب بات صرف یہ ہے کہ ان مختلف دیوتاؤں کے تہوار مختلف ممالک میں مختلف مہینوں میں کیوں منائے جاتے تھے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ قدرت کی کارفرمائیاں مختلف ممالک میں مختلف ہیں۔ مثلاً جو شخص کسی شمالی ملک یا مرتفع معتدل ملک کا

رہنے والا ہے۔ اسکے لیے سورج کا زوال جس کے باعث جاڑے کی شدت ہو جاتی ہے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جو لوگ جنوب میں رہتے ہیں ان کے لیے زوال آفتاب کسقدر راحت بخش ہے اور سال کے زیادہ حصہ میں نباتات کا مردہ رہکر بفصل بہار میں دفعتًا پھولوں کا نکلنا اور اناج کا پیدا ہونا انکے دلوں پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ لہذا ہمکو یہاں دونوں قسم کی روایات کا مرکب قصہ ملتا ہے اور چونکہ مختلف ممالک میں بہار اور برسات کا موسم مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے مختلف ممالک میں یہ تہوار باوقات مختلف منائے جاتے تھے۔

یسوع ناصری کی اصلیت

ہم اس سے قبل یہ بیان کر چکے ہیں کہ فی زمانا بہت سے فلسفی ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو یسوع ناصری کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں۔ اور دیوتاؤں کے مرکر زندہ ہونے اور آسمان پر چلے جانیکی روایات پر جو استدلال ہم نے کیا ہے اس سے یقینًا یسوع کا وجود ہی غائب ہو جاتا ہے مگر اس "دیوتا نژاد" یسوع کا وجود غائب ہوتا ہے جسے عیسائی خدا مانتے ہیں جس کی سوانح عمری اناجیل اربعہ میں لکھی ہے۔ اگر کسی یسوع ناصری کا دنیا میں وجود تھا تو وہ کوئی دوسرا انسان تھا۔

قبل اس کے کہ حقیقت یسوع پر مزید بحث کریں ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ یسوع سے پیشتر بھی دنیا میں زہد و اتقا۔ تجرد و رہبانیت تقوی و پرہیزگاری۔ اور نفس کشی کا مذہب و مشرب موجود تھا۔ یہی باعث تھا کہ ملک یہودیہ میں یسوع ناصری سے بھی پیشتر ایک فرقہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جو ترک دنیا اور زاویہ نشینی کے ساتھ زہد و ریاضت اور تجرد کی زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ اس فرقہ کا نام عیسینی (ESSENE) تھا (ممکن ہے اسی سے لفظ عیسی اور عیسائی نکلا ہو۔) زوال بابل کے بعد جب یہودیوں پر ایرانیوں کا اثر پڑا تو غالبًا اس وقت یہ فرقہ پیدا ہوا تھا۔ ایرانی مذہب میں پاکیزگی اور صفائی پر سخت زور دیا جاتا ہے۔ اور یسوع ناصری سے یقینًا پیشتر مذہب بودیت (BUDHA) ملک یہودیہ میں پہونچگیا تھا۔ جس کا یہودیوں اور یونانیوں اور بعد ازاں عیسائیوں پر بہت اثر پڑا تھا۔ الغرض یسوع مسیح کے زمانہ میں فلسطین کی سرحد پر ان عیسینی راہبوں کی خانقاہیں موجود تھیں اور اس فرقہ کے بہت سے آدمی شہروں میں بھی رہا کرتے تھے۔ چنانچہ مورخ جوزیفس ( ) نے اپنی کتاب "تاریخ یہود" جلد دوم باب ہشتم صفحات ۲ لغایتہ ۱۳ میں اس فرقہ کا حسب ذیل حال درج کیا ہے۔

"یہ عیسینی فرقہ عیش و عشرت کو گناہ سمجھ کر ٹھکرا دیتا ہے۔ صبر و ضبط تجرد رہبانیت اور نفس پر غلبہ حاصل کرنے کو نیکی سمجھتا ہے۔ یہ لوگ شادی نہیں کرتے۔۔۔۔ لیکن شادی بیاہ کے فوائد سے وہ منکر بھی

نہیں ہیں۔ کیونکہ اس سے بقائے نسل انسانی ہوتی ہے۔۔۔۔ یہ لوگ مال و دولت کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اور انمیں کوئی بھی ایسا نہیں جو بمقابلۂ دوسرے ہم مشرب کے زیادہ دولتمند ہو۔ یہ لوگ کسی خاص شہر میں نہیں رہتے بلکہ ہر شہر میں رہتے ہیں اور جب کبھی ان کا کوئی ہم مشرب کسی دوسرے شہر سے مہمان آتا ہے تو جو کچھ میزبان کے پاس ہوتا ہے وہ سب پیش کر دیتا ہے گویا وہ اسی کا مال ہے۔۔۔۔ اسی وجہ سے یہ لوگ سفر میں اپنے ساتھ کچھ بھی لیکر نہیں نکلتے۔ خواہ انکو کتنا ہی طویل سفر درپیش ہو جو کپڑا انکے تن پر یا جوتہ انکے پاؤں میں ہوتا ہے وہ جبتک پھٹ نہ جائے بدلا نہیں جاتا۔ یہ لوگ آپس میں خرید و فروخت نہیں کرتے بلکہ ہر شخص کے پاس جو چیز ہوتی ہے اس سے حسب ضرورت دوسرا شخص کام لے سکتا ہے یہ لوگ بہت سادہ غذا کھاتے ہیں۔ کبھی کئی بار غسل کرتے ہیں۔ محنت سے جان نہیں چراتے اور نماز دعا میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے وفادار ہوتے ہیں، جو بات ایک بار اپنی زبان سے کہدیتے ہیں اس سے کبھی نہیں ٹلتے۔ لیکن یہ لوگ قسم کھانے سے پرہیز کرتے ہیں بلکہ اسے برا سمجھتے ہیں جب کوئی نیا شخص اس فرقہ میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اسے دو سال تک امیدواری کرنا پڑتی ہے پھر اسے اصطباغ دیکر دو سال تک مزید امتحان لیا جاتا ہے اس کے بعد مرید کیا جاتا ہے۔ اور قبل اس کے کہ نئے آدمی کو وہ اپنے دستر خوان پر بٹھائیں یا کھانے کو ہاتھ لگانے دیں وہ اس شخص سے سخت حلف لیتے ہیں کہ ———— (۱) میں خدا سے ڈرونگا۔ اسمیں کسی کو شریک نکرونگا۔ یعنی حقوق اللہ پوری طرح سے ادا کرونگا۔ (۲) آدمیوں کے ساتھ ہمیشہ نیکی اور انصاف سے پیش آؤنگا۔ یعنی حقوق العباد ادا کروں گا (۳) کسی شخص کو خود اپنے دل سے یا کسی دوسرے کے کہنے سے ہرگز نقصان نہیں پہنچاؤنگا (۴) بدوں سے ہمیشہ نفرت اور نیکوں کی اعانت کرونگا (۵) ہر شخص سے محبت و وفاداری سے پیش آؤنگا۔ خصوصاً ارباب حل و عقد کی ہمیشہ اطاعت کروں گا۔ کیونکہ بغیر تائید ایزدی کے کسی شخص کو حکومت نصیب نہیں ہوتی (۶) اگر میں خود صاحب الامر ہونگا تو میں اپنے اختیارات سے ہرگز کوئی خلاف کام نہ کرونگا (۷) ہمیشہ سچائی سے محبت کرونگا (۸) جھوٹ بولنے والوں کی ہمیشہ تادیب کرونگا (۹) اپنا ہاتھ چوری سے اور اپنی روح کو ناجائز خواہشوں سے پاک رکھوں گا۔

مندرجہ بالا تعلیم کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یسوع کی تعلیم نے اہیں کچھ بھی اضافہ نہیں کیا۔ جو طور و طریق اور جو مشغلہ ان عیسینی راہبوں کا بتایا گیا ہے وہی زندگی اور وہی مشغلہ یسوع ناصری کا تھا۔ دولت سے نفرت، عصمت و طہارت، تجرد و رہبانیت غریبوں کی مدد و محبت بنی نوع انسان

وغیرہ وغیرہ بھی تعلیم یسوع نے دی ہے۔ اب فرض کیجئے کہ اس فرقہ کا ایک شخص آزادانہ روح رکھتا ہے، لوگوں کو سمجھاتا ہے کہ خدا کی حکومت قریب ہے۔ یعنی قیامت آنیوالی ہے۔ جبکہ ہر شخص کے اعمال تولے جائیں گے۔ اس لئے گناہوں سے توبہ کرو۔ مجھے خدا نے تمہاری ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ تو یہ شخص یقیناً یسوع ناصری تھا۔ یسوع ناصری بھی لوگوں کو قسمیں کھانے سے منع کرتا تھا۔

الغرض حقیقت مسیح یہ ہے کہ شہر ناصرہ کے رہنے والے ایک شخص یوسف نجار کا ایک بیٹا یسوع نامی بچپن ہی میں فرقہ عیسینی کے اندر داخل ہو گیا تھا۔ اس فرقہ کے لوگوں سے یسوع نے ترک لذات نفس کشی، نفرت کرنا سیکھا۔ ہمیشہ ایک لبادہ پہنے ہوئے قلندرانہ طور پر زندگی بسر کرتا رہا۔ اس کا نہ کوئی مقررہ گھر تھا نہ ٹھکانا۔ وہ کبھی دولت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ لوگوں سے اسے اس قدر محبت تھی کہ وہ بیماروں کا علاج کرتا تھا۔ اور جو کچھ اس کے پاس ہوتا تھا دوسروں کو دینے سے ہرگز دریغ نہ کرتا تھا۔

اس یسوع کی طبیعت کسی قدر جوشیلی واقع ہوئی تھی۔ عیسینی فرقہ کے راہب اگرچہ رسمی قربانیوں سے انکار کرتے تھے۔ لیکن یسوع ایسی رسموں سے سخت متنفر تھا۔ اس نے ان یہودیوں کے خلاف وعظ و تلقین کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ اسے خود دولت سے نفرت تھی۔ اسلئے وہ بعض اوقات دولتمندوں کے خلاف بھی زہر اگلنے لگتا تھا اور چونکہ وعظ و نصیحت سے اسے کسی فائدہ کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے ایسے بےغرض شخص کی باتیں سننے کے لئے مجمع کثیر جمع ہو جاتا تھا۔ وہ لوگوں کو قرب قیامت سے ڈرا کر ان میں متقیانہ زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ اپنی روحوں کو یوم الحساب کے لئے تیار کرو۔ ممکن ہے کہ اپنی نفس کشی اور زہد و تقوے کی بنا پر وہ خود کو خدا کا بیٹا بھی کہہ بیٹھا ہو۔ اور یہی بہانہ لوگوں کو اسے سزا دینے کا ہاتھ آیا۔ یہودیوں نے اسے ستانا شروع کر دیا۔ اس لئے وہ رمتے جوگی کی طرح فلسطین سے غائب ہو گیا۔ نہ اسے کسی نے صلیب پر چڑھایا نہ کسی نے قتل کیا۔ اور یہی ہمارے نزدیک صحیح تاریخی واقعہ ہے۔ اس کے بعد لوگوں نے اناجیل اربع کی کہانیاں تصنیف کر کے اس متقی و پرہیزگار ناصح مشفق کو خدا کا بیٹا بلکہ خدا بنا دیا۔ اور اسکے سوانح حیات طلسم ہوشربا کے افسانے بنا دئے گئے۔

اب میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس تحقیق کے بعد بھی ایک مسلمان اس بات کا قائل رہیگا کہ قرآن میں مسیح کے حالات وہی ہیں جو انجیل میں بیان کئے گئے ہیں یا وہ جو کسی سال ماسبق کے نگار میں میں نے عرض کئے تھے

۱ — نیاز

(بقیہ ملاحظات صفحہ ۸)

بہر حال اس دورِ نامرادی میں یہ شکوہ و شکایت بیکار ہے۔ کیونکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیندہ کے لئے ہمارا "لائحۂ عمل" کیا ہونا چاہئیے۔ سو اس کا جواب تم مولویوں سے نہ چاہو جو تبلیغ کے نام سے نہایت ہی غیر مصلحانہ فضا پیدا کر رہے ہیں۔ نہ اُن مدعیان ترقی و اصلاح سے جو تنظیم کانفرنس وغیرہ کی مضرت رساں تحریک سے حکومت کی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کو تقویت پہونچا رہے ہیں۔ اس کا جواب خود اپنے آپ سے چاہو، اس جذبۂ انسانیت سے طلب کرو جو سب سے پہلے انسان کو رشتۂ وطنیت سے وابستہ کرتا ہے۔

مذہب اور مذہبیت کا دور ختم ہو گیا، اب صرف زمانہ وطن پرستی کا ہے۔ اس لئے اگر مسلمان اپنے آپ کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں سب سے پہلے اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھ کر ملک کی دوسری قوموں سے مل جانا چاہئیے اور ہر اس تحریک میں پورے جوش و سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا چاہئیے جو ملک کی ترقی و آزادی کی ضامن ہے۔ مذہب بالکل ذاتی و انفرادی اطمینان کا نام ہے، اس لئے اسکو ہیئت اجتماعی کی بنیاد نہ بناؤ اور اس کو استخوانِ جنگ قرار نہ دو کہ مذہب کی گزشتہ تاریخ پہلے ہی بہت کافی خون سے رنگین نظر آتی ہے اور اس میں اب کسی اور خونیں اضافہ کی ضرورت نہیں۔

ماہ مارچ کے بعد سے جب ہم نے بہ سلسلۂ ملاحظات گاندھی اروِن مفاہمت کی پیشنگوئی کی تھی۔ بہت سے واقعات و حالات ملک میں ایسے رونما ہوئے کہ ان پر رائے زنی ضروری معلوم ہوتی ہے۔

مہاتما گاندھی نے جس حسن تدبیر و خوش سلیقگی کے ساتھ سابق وائسرائے (لارڈ اروِن) سے گفتگو کر کے ملک کے اضطراب میں تبدیلی پیدا کی، اس کا اعتراف اُن دشمنوں کو بھی ہے جو سرزمین ہند سے باہر، یہاں کے مسائل کو نہایت غیر متاثرانہ انداز سے دیکھنے کے عادی ہیں اور غالباً تاریخ برطانیۂ ہند کا یہ بالکل پہلا واقعہ ہے کہ اس نے ملک کی کسی جماعت سے اس انداز سے صلح کی ہو کہ اگر کوئی چاہے تو اُسے مغلوبیت سے بھی تعبیر کر سکتی ہے۔ بہر حال یہ فتح کانگرس کی ہو یا برطانیہ کی مصلحت اندیشی و صلح کوشی کی، یہ حقیقت کبھی نظر انداز نہیں کیجا سکتی کہ راونڈ ٹیبل کانفرنس کی تمام گھما گھمی، اکابر ہند کی جملہ فصاحتیں اور بلاغتیں جو ولایت میں صرف کی گئیں، اسوقت تک کوئی نتیجہ نہ پیدا کر سکیں، جب تک ہندوستان کے اس ضعیف و نزار شخص کی مدد نہ چاہی گئی۔ جس کو مفقود رکھتے ہوئے، ولایت کی اس تاریخی کانفرنس کی کامیابی کا خواب ملک کے ہر گوشہ میں دیکھا جا رہا تھا۔ حقیقتاً گاندھی کی عظیم الشان

شخصیت کی یہ اتنی بڑی فتح ہے کہ مشکل ہی سے اس کی کوئی دوسری نظیر مل سکتی ہے۔

جن شرائط پر یہ صلح طے پائی تھی، ان کی توثیق کے لئے ضرورت تھی کہ کانگرس کا اجلاس جلد سے جلد منعقد کیا جائے، اور غالباً اس سے زیادہ اہل کانگرس کی زندگی اور قوت عمل کا ثبوت اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ گاندھی ارون مصالحت کے تقریباً بیس دن کے اندر ہی کراچی میں چالیس پچاس ہزار نفوس کا اجتماع ہوگیا۔

ہر چند مہاتما گاندھی نے یہ صلح جمعیت عاملہ کے مشورہ سے کی تھی، لیکن اس کا یقین کامل نہیں تھا کہ کانگرس کے کھُلے اجلاس میں آسانی کے ساتھ شرائط صلح کو تسلیم کرلیا جائے گا۔ اور اس اندیشہ کو بھگت سنگھ کے قصاص نے اور زیادہ قوی بنادیا۔ چنانچہ جو خدشہ تھا وہ ظاہر ہو کر رہا۔ اور ایک جماعت ایسی رونما ہوگئی جو صلح کے شرائط پر راضی نہ تھی اور اس نے مہاتما گاندھی کا خیر مقدم کراچی میں سیاہ جھنڈوں کو بیک کے نعروں سے کیا اور انسانی خون کا بھرا ہوا پیالہ اُن کے سامنے پیش کرکے انتہائی بیزاری کا اظہار کیا۔ لیکن اس کوہ راسخ اور آہنی عزم والے انسان نے جس کا نام گاندھی ہے، ایک لمحہ کے لئے بھی مایوسی کو راہ نہ دی اور آخر کار یہاں بھی فضا کے بادل چھٹ کر رہے اور کانگرس کے کھُلے اجلاس نے شرائط صلح پر توثیق ثبت کردی۔ لیکن ٹھیک اسی وقت جبکہ کراچی میں آزادی ملک کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ دہلی میں بدنصیب مسلمانوں کے بعض ناعاقبت اندیش افراد آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے نام سے آزادی کی قبر کھودنے میں مصروف تھے، حریت کا جنازہ نکالنے کی طیاریاں کر رہے تھے۔ انھوں نے یہاں کیا کیا۔ اس کی داستان گو طویل ہے لیکن جدید نہیں ہے، وہی مطالبات کا رونا، وہی دریدہ حکومت کی کاسہ لیسی اور وہی بزدلی وکم ہمتی جو ہمیشہ اس رجعت پسند جماعت نے ظاہر کی۔ کراچی سے مہاتما گاندھی کو بھی شرکت کی دعوت دی اور جب انھوں نے نہایت صفائی کے ساتھ کہدیا کہ میں ہر اس مطالبہ کے ماننے کے لئے تیار ہوں جس کو مسلمان متفقہ طور پر پیش کریں، تو ان کے تمام جوش و خروش پر اوس پڑ گئی اور یہاں سے نکلکر بمبئی وغیرہ میں پھر وہی کائیں کائیں شروع کردی جو اس جماعت کی قدیم بزدلانہ عادت ہے۔

یقیناً بنارس اور خصوصیت کے ساتھ کانپور کے فساد نے اس جماعت کی امیدوں کو تھوڑے دنوں کے لئے اور زندہ کردیا اور اس میں شک نہیں کہ ملک کی جس آبادی نے یہ فساد برپا کیا وہ سخت ملامت کے قابل ہے۔ لیکن کیا یہ واقعات ملک کا صحیح نصب العین بدل سکتے ہیں، کیا ہم چند درندوں کی وحشیانہ حرکات سے متاثر ہوکر آزادی ملک کے حصول سے باز رہ سکتے ہیں۔ جب

کسی ملک میں انقلاب رونما ہونے لگتا ہے تو ضعیف ترین عناصر کو بھی ایک بار خروش میں آنے کا موقعہ ملجاتا ہے اس لئے اس نوع کے ہنگامے قابل افسوس ضرور ہیں، لیکن ہمکو منزل مقصود سے تو علیحدہ نہیں کرسکتے۔ ایسے وقت میں ہمارا فرض یہ ہونا چاہئیے کہ ہم اس نوع کے اختلافات سے بالکل بے نیازانہ گزر جائیں۔ اور جلد سے جلد اس سررشتہ کو اپنے ہاتھ میں لیلیں جو ہمیشہ کے لئے اس اختلاف و تصادم کو مٹا دینے والا ہے۔ لیکن ہمارے بعض نا عاقبت اندیش اکابر نے ان واقعات سے ناجائز فائدہ اٹھاکر نہایت سخت مکروہ و مسموم قسم کا پروپاگنڈا شروع کردیا جو اختلاف کی خلیج کو اور زیادہ وسیع کردینے والا ہے۔

یہ حضرات ان واقعات کو اس امر کی دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ اگر مخلوط انتخاب تسلیم کرلیا گیا تو ہندؤوں کی اکثریت ہمیشہ مسلمانوں کو اسی طرح تباہ و برباد کرتی رہیگی۔ اور ان کی تمام مذہبی و معاشرتی آزادیاں چھین جائیں گی۔ حالانکہ اگر نگاہ غور سے دیکھا جائے تو ہندو مسلم اتحاد کی صورت اگر کوئی نظر آسکتی ہے تو وہ صرف مخلوط انتخاب ہے۔

اب سے تقریباً ایک ربع صدی قبل جب منٹو مارلے رفارم ہندوستان کو مرحمت نہ ہوا تھا یہاں جداگانہ انتخاب کا خیال تک کسی کے ذہن میں بھی نہ تھا اور اُسوقت کی فضا جیسی صلح کوش اور امن پرور تھی کسی سے مخفی نہیں۔ نہ باہم قربانی پر کہیں جھگڑا ہوتا تھا، نہ مسجد، و مندر کے سامنے باجہ و ناقوس پر کوئی نزاع ہوتی تھی، ہر فریق نہایت امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا، لیکن جب جدید رفارم کے سلسلہ میں مسلمانوں کے وفد کو شملہ بلاکر ان کے کانمیں جداگانہ انتخاب کا افسوں پھونکا گیا، تو دفعتاً صورت حال بدل گئی اور پھر گذشتہ بیس سال کی تاریخ ہند اُٹھاکر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ فساد و ہنگامے اسی زمانہ میں ہوا اور ہندو مسلمانوں کے درمیان باہم اختلاف و عصبیت پیدا ہونے کا دور یہی تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اقلیت کے لئے مخصوص و متعین نشستیں طے کردی گئی ہیں تو مخلوط انتخاب سے کیوں خوف کھایا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے جتنی جگہیں مقرر ہیں وہ انھیں سے پر کی جائینگی اور مخلوط انتخاب اس میں کوئی کمی نہیں کرسکتا۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا فائدہ جو ملک کو پہونچیگا وہ یہ ہے کہ ہر ہندو اور ہر مسلمان باہم گر تعلقات صلح و آشتی قائم کرنے پر مجبور ہوگا، کیونکہ نہ کوئی ہندو بغیر مسلمانوں کی رائے کے ممبر منتخب ہوسکیگا۔ اور نہ کوئی مسلمان بغیر ہندو آراء کے۔ اسطرح گویا دونوں قومیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے اور معاشرتی، مذہبی، تمدنی جذبات کا احترام کرنے پر مجبور ہوں گی اور رفتہ رفتہ وطنیت کی وہ صحیح روح پیدا ہوجائیگی، جس کو اس وقت تک جداگانہ انتخاب کی لعنت نے فنا کر رکھا تھا۔

جداگانہ انتخاب کی سب سے بڑی مضرت جس کو نظر انداز کیا جارہا ہے یہ ہے کہ جب ہر فریق

کے رائے دہندگان جدا جدا ہونگے تو ہر ممبر اپنی جماعت کے سامنے اسباب تفوق میں سب سے زیادہ جس استحقاق کو نمایاں کریگا وہ فریق ثانی کی مخالفت ہوگی، یعنی ایک مسلمان صرف اس دلیل کی بنا پر کثرت رائے حاصل کریگا کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کی پوری حمایت کرے گا اور اسی طرح ایک ہندو صرف اس حجت پر نامزد کیا جائیگا کہ وہ مسلمانوں کو ابھرنے نہ دیگا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں جماعتوں کے صرف وہی افراد نامزد ہونگے جو حد درجہ متعصب اور فرقہ وارانہ جذبات رکھنے والے ہیں اور اس طرح ملک میں رفتہ رفتہ ایسا اختلاف و انشقاق پیدا ہو جائیگا کہ ایک لمحہ بھی امن و سکون کا ملنا دشوار ہو جائے گا۔ برخلاف اسکے مخلوط انتخاب ہمیں مجبور کریگا کہ ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھیں اور تدریجاً وہ ذہنیت محو ہو جائے جو "ہندو چاء" اور "مسلمان پانی" کے وجود کا باعث ہوئی ہے۔

ایک شبہ مخلوط انتخاب کے مخالفین کا یہ بھی ہے کہ اس صورت میں جو مسلمان نامزد ہونگے وہ ہندوؤں کی کثرت رائے کی وجہ سے وہی ہونگے جو ہندوؤں کا ساتھ دیں۔ اول تو یہ الزام ایسا ہے جو بجائے ہندوؤں کے خود اپنے ہی افراد پر قائم ہوتا ہے اور خود ہمیں اپنے آپ سے اس باب میں شرم کرنا چاہیئے اور دوسرے یہ کہ وہ کون سے ایسے مسائل ہیں جن کے طے کرنے کے لئے ہمکو نہایت سخت کٹر قسم کے مسلمان ممبروں کی ضرورت ہوگی، ظاہر ہے کہ کونسل میں اکثر مسائل وہ ہونگے جن میں ہندو مسلم مفاد مشترک ہوگا۔ اگر پانچ فی صدی ایسے مسائل پیش بھی ہوئے جنکا تعلق خالص مذہب سے ہے تو کیا کسی مسلمان کی طرف سے یہ اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ مذہب کے خلاف کوشش کریگا۔ خواہ وہ ہندوؤں ہی کی کثرت آراء سے کیوں نہ منتخب ہوا ہو۔ پھر اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر یو۔پی کے مسلمان اپنی اقلیت کی وجہ سے اس امر کا اندیشہ کرتے ہیں تو کیا پنجاب، بنگال، سندھ، اور سرحد کے ہندوؤں کو یہ اندیشہ نہ پیدا ہوگا اور کیا ہندو مسلمان دونوں کے لئے یہ قدرتی تحفظ پہلے سے موجود نہیں ہے۔ اگر یوپی کے ہندو یہاں کے مسلمانوں کے حقوق پامال کرینگے کیا تو انھیں یہ خوف نہ ہوگا کہ اسکی پاداش میں پنجاب وغیرہ کے ہندوؤں کے حقوق اسی طرح تلف کئے جا سکتے ہیں۔

الغرض میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ مخلوط انتخاب سے مسلمانوں کو کیوں خائف ہونا چاہیئے۔ اور جداگانہ انتخاب میں ان کے لئے کیا نفع ہے۔ پھر اسی کے ساتھ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ یہ اندیشہ مسلمانوں میں کس رکیک و ادنیٰ ذہنیت کے ماتحت پیدا ہوا ہے اور انکے مستقبل کو کس درجہ تاریک اور پر از خوف بنا دینے والا ہے تو میرے سامنے اسی جماعت کے وہ پرجوش اقوال و مواعظ سامنے آجاتے ہیں۔ جب وہ اپنی قوم کے دس افراد کو بھی فریق مخالف کے ہزار نفوس پر بھاری ظاہر کرتے تھے۔

کیا دنیا میں کوئی قوت ایسی ہو سکتی ہے جو کروڑ نفوس کو تباہ و برباد کر دے، کیا یہ ممکن ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے دوش بدوش پورے جوش وطنیت کے ساتھ آمادۂ کار ہو جائیں، اور وہ

سارے ملک پر نہ چھا جائیں، حیرت ہے کہ مسلمانوں کی غیرت و خودداری کیا ہوئی، ان کی شجاعت و بسالت کی روایات کیونکر محو ہو گئیں اور وہ کیوں اسقدر بزدل و ذلیل ہو گئے ہیں، کہ اپنی نجات صرف جداگانہ انتخاب کے ذریعہ سے چاہتے ہیں، جسکی بنیاد ہی خوف و تذبذب، کم ہمتی اور جبن پر قائم ہوتی ہے۔

ہمکو معلوم ہے کہ جو جماعت آجکل مسلمانوں میں اس تحریک کو قوی کر رہی ہے وہ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی بدخواہ ہے بلکہ حکومت کی طرفدار ہے اور محض اغراض ذاتی و نفسانی کی بناء پر ملک و قوم کو تباہ کرنے کے لئے آمادہ ہو گئی ہے۔

یہ وقت وہ ہے کہ مسلمانوں کو صرف یہ درس دینا چاہیئے کہ

شیر شعر شیرانہ، در صحرائے شیراں پائی نہ

تاکہ وہ دوسری بیدار قوموں کے ساتھ زندہ رہنے کی اہلیت پیدا کر سکیں، لیکن ہمارے بعض ناعاقبت اندیش اور خود غرض اکابر یہ درس دے رہے ہیں کہ نجات صرف اسی میں ہے کہ حکومت کے ہات کو قوی بنایا جائے اور حکومت ہی سے طلب امن و نجات کیجائے۔ درآنحالیکہ کانپور کے ہنگامہ نے اس خواب کی تعبیر کو بھی جن الفاظ میں پیش کیا ہے، وہ بہت کچھ درس عبرت اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے۔

جداگانہ انتخاب والوں کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہندو افراد بہت زیادہ عصبیت سے کام لیتے ہیں۔ اور جن محکموں میں وہ پہونچ جاتے ہیں، وہاں مسلمانوں کے ساتھ برا سلوک ہونے لگتا ہے۔ اس لئے آئندہ مخلوط انتخاب کے سلسلہ میں ان سے کیا توقع قائم کی جاسکتی ہے۔ اول تو اس دلیل کے دونوں اجزاء میں باہم کوئی ربط نہیں اگر وہ عصبیت سے کام لیتے ہیں تو مخلوط انتخاب کیوں مضر ثابت ہوگا، بلکہ وہ تو مفید ثابت ہوگا کیونکہ ہندو بھی مسلمان آراء کے محتاج ہوں گے اور مجبوراً ان کو اپنی عصبیت ترک کرنا پڑے گی۔ علاوہ اس کے یوں بھی اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندو عصبیت اسی وقت سے پیدا ہوئی ہے جب سے منٹو مارلے اسکیم کا نفاذ ہوا ہے اور جداگانہ حق انتخاب پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ اختلاف کے اصل سبب کو تو قائم رکھا جائے اور اس کے دور کرنے کی بھی خواہش کیجائے۔

حال ہی میں جو جلسہ نیشنلسٹ مسلم پارٹی کا لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا اور جس میں میں بھی شریک تھا، متفقہ طور پر مخلوط انتخاب کو منظور کر لیا گیا ہے اور مسلمانوں کو اسی پر آخیر وقت تک قائم رہنا چاہیئے۔

بعض مخالفین جماعتوں کی طرف سے جو پروپاگنڈا کیا جارہا ہے وہ سخت غیر دانشمندانہ ہے اور مسلمانوں کو اس میں حصہ لینے، یا اس پر عمل کرنے سے سخت احتراز کرنا چاہیئے۔

جب تک ہندوستان کی آبادی قائم ہے۔ ہندو مسلمانوں کو باہم ملکر یہیں زندگی بسر کرنا ہے

اور وہ مجبور ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ رواداری اور صلح و آشتی کے ساتھ برادرانہ سلوک کو روا رکھیں۔ اس لئے نہ یہ عارض ہنگامے قابل لحاظ ہیں اور نہ ایسی تحریکیں جو نفاق و اختلاف کی پرورش کرنیوالی ہیں۔ اُن کو بھی آخرکار مٹ کر رہنا ہے اور اِن کو بھی فنا ہو جانا۔ اس لئے آپ آج ہی وہ کام کیوں نہ کریں۔ جیسے کل مجبوراً اختیار کرنا ہے۔

فلسفہ مذہب

مولوی سید مقبول احمد صاحب بی۔ اے کی وہ معرکۃ الآراء تصنیف جس نے تمام ملک کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ معہ محصول (۴؍عہ)

(مینیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ)

کاجل۔ سرمہ۔ چورن۔ منجن

ڈاکٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کر کے اپنی رائے انکی مفید ہونے کی ظاہر کی ہے (اکتوبر کے ملاحظات)

صرف یہ چار چیزیں میرے پاس ہیں اور اگر آپ اعتبار کریں تو میں کہوں کہ ان میں سے ہر ایک چیز لوہے بیس سال سے میرے خاندان کی تجربہ میں رہی ہے

کاجل جو آنکھوں کے تمام امراض کیلئے بیحد مفید ہے۔ سلائی لگاتے ہی ٹھنڈی ٹھنڈی سی آ نیلگتی ہے۔ جنکی آنکھیں آشوب کرتی رہتی رہتی ہیں یا میلی ہو جاتی ہیں۔ یا سرخی پیدا ہو جاتی ہے یا نزلہ کا پانی آتا رہتا ہے یا ضعف بصارت پیدا ہو چلا ہے انکو ہر روز رات کو ایک سلائی لگا لینا چند دنوں میں تمام شکایتیں دور کر دیتا ہے۔ ایک ڈبیہ جو ایک شخص کیلئے سال بھر کو کافی ہے قیمت عمہ۔

سُرمہ یہ بیش بہا سرمہ ۴۰ دن میں تیار ہوتا ہے۔ اسمیں نہ ممیرہ ہے، نہ کوئی جواہر بلکہ معمولی سرمہ ہے جس کو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیسکر طیار کیا جاتا ہے۔ اسکے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا، دھندل موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بارہا آزمایا ہوا ہے۔ قیمت فی پڑیا (عمہ) علاوہ محصول

چورن یہ وہ اکسیری چیز ہے جسکا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیٹ کا درد، قبض، نفخ، ریاح کا پیدا ہونا، سوء ہضم دستوں کا آنا سب بیکلخت اسکے استعمال سے جاتا رہتا ہے کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو فوراً ایک چٹکی کھانے سے جاتا رہتا ہے قیمت فی ڈبہ ۴ تولہ (عمہ) علاوہ محصول

منجن۔ اسکی ادنےٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبہ ۸ تولہ (۸عہ) علاوہ محصول۔

نوٹ۔ سب چیزیں منگانیوالوں کو محصول ڈاک معاف۔

م۔ بیگم۔ نمبر ۲۴۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ۔

"ہنگامۂ کانپور"

اسقدر بیداد، اتنا ظلم، ایسا قتل عام
خوابِ آزادی کی یہ تعبیر! ای ہندی غلام

کاش دُنیا اژدہا بن کر چبا لیتی تجھے
آسماں سے برق گرتی اور جلا دیتی تجھے

ننگ ہے اقدامِ عالم کے لئے تیرا وجود
موت سے بدتر، تری خوابیدہ ہستی کی نمود!

جانتا ہے قلعۂ ظلمات کو قصرِ ضیا
سمِ قاتل پر گمانِ بادۂ نابِ بقا

آہ، بیجرم و خطا بچوں کی یہ چیخیں نہیں
ترے قدموں پہ نہیں مظلوم ماؤں کی جبیں

خاک و خوں میں یہ نہیں غلطاں شہیدانِ ستم
روئے گردوں پہ نہیں یہ تیرہ تر گردِ الم

خونِ انسانی کی یہ موجیں نہیں، آبد شعار
جن سے تو نے دامنِ گیتی کیا ہے داغدار

سُن کہ ہر ذرّے سے اُٹھتی ہے صدائے الاماں
ہیں یہ آزادی کی ظالم! حشر پرور سسکیاں

عقل کے دشمن، رہینِ جہل، مجبورِ جنوں
کر رہا ہے اپنے ہاتھوں آپ آزادی کا خون

اُڑ رہی ہیں جامۂ قومی کی پیہم دھجیاں
تو کہاں، ناداں! اور پیکارِ آزادی کہاں!

ہر قدم، وحشت خرامی، کج نگاہی، خودسری
اس قدر گمراہیوں پہ نازشِ منزل رسی

دوسری اقوام چھیڑیں نغمۂ شانِ وطن
اور تو ہو مجرمِ خونِ عزیزانِ وطن

اس کمالِ بزدلی پر خواہشِ فتح مبیں
بھائیوں کے خون سے رنگیں ہے تیری آستیں

کس کا شکوہ، دہر میں جب آپ تو پامال ہے
تجھ سے کیوں دُنیا کو ہمدردی ہو، گر جاہل ہے

تو اور آزادی کے ایوانِ گرامی کیلئے
تو بنا ہے حلقۂ دامِ غلامی کیلئے

علی اختر

جھوٹ اور سچ کا مناظرہ

چاہا جو جھوٹ نے کہ کردں سچ کو لاجواب
کہنے لگا کہ آج کہاں ہے مرا جواب
ذرہ سے آفتاب تلک راج ہے مرا
دیکھو جسے جہان میں محتاج ہے مرا
امکاں مری کمندِ رسا میں اسیر ہے
عالم مرے وجود سے رونق پذیر ہے
اس انجمن میں اہلِ سخن کی زبان ہوں
ایمان واعظوں کا حسینوں کی جان ہوں
بازارِ زندگی میں مرا فیضِ عام ہے
کاریگروں کو شام و سحر مجھ سے کام ہے
کس مولوی کے واسطے روزی رساں نہیں
کس نکتہ رس وکیل کا زورِ بیاں نہیں
سلطاں مری مدد سے رعیت فریب ہے
مزدور مجھ سے واقفِ اوج و نشیب ہے
بزمِ حیات میں مرے جلوے ہزار ہیں
میں ایک چیز، نام مرے بے شمار ہیں
طرزِ عمل کہیں ہوں کہیں ہوں طریق کار
الہام ہوں کہیں کہیں پیغامِ کردگار
دینِ مبیں کہیں، کہیں مذہب ہے میرا نام
مہر و وفا کہیں، کہیں الفت ہے میرا نام
پیرانِ خانقاہ کا ارشاد ہوں کہیں
عطار اور طبیب کا استاد ہوں کہیں
معشوق کی زبان کا پیغام ہوں کبھی
عاشق کی جانِ زار کا آرام ہوں کبھی
کرتا ہوں اک نگاہ سے روباہ کو پلنگ
پاتا ہوں فتح جنگ میں بے تیغ و بے تفنگ
قانون میرے بحر کی موجِ تپاں ہے ایک
تاریخ میرے دشت کی جوئے رواں ہے ایک
میری ہی چاشنی سے فسانے ہیں دلپسند
مجھ سے ہی پُر اثر ہے سخنور کا بند بند

ملتا نہیں نشان مرا کس دیار میں
دنیا کا خشک و تر ہے مرے اختیار میں

تو ہے کہ جانتا ہی نہیں دوستی ہے کیا
غم سے کسی غریب کی جاں پر بنی ہے کیا
افعی ہے تو عتاب ہے شاہیں ہے سر بسر
تیرا لباس خون سے رنگیں ہے سر بسر
شمشیر زن ہے تو کبھی مذہب کے نام پر
خنجر بکف کبھی ہے حلال و حرام پر

انصاف کے لباس میں جنگ آزما کبھی
اخلاق کے جنوں میں غضب آشنا کبھی

رحمت تری زباں نہیں ہے تیغ دودم کا نام
رکھا ہے تو نے حق کی حمایت ستم کا نام

مجرم کی بے بسی پہ نہیں اشکبار تو
ناصح تو ہے نہیں ہے مگر غمگسار تو

تعزیر سے کسی کو بچایا بھی ہے کبھی
تو نے کسی کا عیب چھپایا بھی ہے کبھی

کوئی ستم نصیب ترا مدح خواں نہیں
تیری زباں پہ دار و رسن ہے اماں نہیں

شر سے قریب لطف و مروت سے دور ہے
ہر روز تیرے واسطے یوم النشور ہے

تیرے جلو میں آگ ہے آبِ بقا نہیں
تیرے عمل میں قہر ہے لطف و عطا نہیں

تیرے سبب سے طوق و رسن کا رواج ہے
گر تو نہ ہو تو جیل کی کیا احتیاج ہے

ساری زمیں ہے تیری عنایت سے لالہ گوں
دنیا میں تیرے نام پہ بہتا ہے کتنا خوں

یہ بات سُن کے سچ نے کہا اے شریر جھوٹ
آتا نہ سر اُٹھا تہ گردِل حقیر جھوٹ

یہ کیا کہا کہ کوئی مرا قدرداں نہیں
دوزخ سے کم نہیں وہ زمیں میں جہاں نہیں

میں روحِ کائنات ہوں تو ایک مشتِ گل
بزدل ترے غلام مرے دوست شیر دل

رہتا نہیں ہے تیری امانت میں ایک تار
دنیا میں کس غریب کو ہے تجھ پہ اعتبار

اس کو کبھی جہاں میں نہ دیکھا فروغ پہ
جس کام کی اساس ہے کذب و دروغ پہ

کاریگروں نے لی جو مدد تجھ سے ایک بار
پھر عمر بھر چلا نہ کبھی ان کا کاروبار

عشرت کا بیج دہر میں بوتا ہے اور کون
تجار کے جہاز ڈبوتا ہے اور کون

تیرے سبب سے دامنِ آفاق ہے سیاہ
پلتا ہے تیری گود میں ہر جرم ہر گناہ

دنیا میں باعث ستم و جور کون ہے
زندانیوں میں تیرے سوا اور کون ہے

عزت اُسی کی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے
کیا اُس کا احترام کہ جھوٹا کہیں جسے

تجھ سے تو اضطراب میں ہے پیرزال بھی
بچتا نہیں ہے تجھ سے یتیموں کا مال بھی

جس شعر یا خیال کی تو نے رکھی بنا
فطرت کے ذوق نے اُسے اچھا نہیں کہا

دنیا میں مولوی کبھی ہوتا نہ کامگار
کرتا نہ گر تجھے مرے پردہ میں آشکار

کچھ روز کے لئے ہے وہاں تیرا احترام
جس جا کیا ہے پیش تجھے دیکے میرا نام

گر ہے تو میرے بھیس میں اہلِ حشم ہے تو
کیا اپنے نام سے بھی کہیں محترم ہے تو

کب ہے کسی کے وعدہ پہ عاشق کو اعتماد
یعنی کسی کے وعدہ پہ ہوتا جو اعتبار
زیرِ فلک ہوا و ہوس میں ہے تو اسیر
ہوتا ہے جب جہاں میں تیرا فریب عام
تیرے ستم سے امنِ جہاں میں خلل ہو جب

تجھ کو نہیں ہے حضرتِ غالب کا قول یاد
فرطِ خوشی سے مرگئے ہوتے وفا شعار
پیدا ہوئے ہیں تیرے ہی دم سے تفنگ و تیر
مجبور ہو کے تیغ کو کرتا ہوں بے نیام
ہر سمت شش جہات میں تیرا عمل ہو جب

اُسوقت میں تفنگ سے خنجر سے نار سے
کرتا ہوں ہمکنار جہاں کو بہار سے

اصغر حسین خاں نظیر لودہیانوی

پُرانے گراموفون ریکارڈ مت پھینکو

کیونکہ وہ پھر نئے ہو جاتے ہیں

سائنسدانوں نے حال میں ایک حیرتناک شے دریافت کی ہے جسے کیمیائی اصطلاح میں زیڈ کہتے ہیں۔

زیڈ کی ایک شیشی سے کم و بیش چالیس پرانے گھسے ہوئے ریکارڈ درست ہو جاتے ہیں۔ وہی دلکش نغمے جو کانوں کو بہت بھلے لگتے تھے، جو کثرتِ استعمال سے ماند پڑ گئے، اصلی حالت پر عود کر آتے ہیں۔ زیڈ ریکارڈ کی کھرکھراہٹ دور کر دیتا ہے، ایک شیشی کی قیمت صرف (۲/۸)

ZED

ملنے کا پتہ:۔ حسن برادرز اینڈ سنز، پنڈرئی، سی، پی، ہندستان

محبت کی شام!

(۱)

جبرِ دنیائے تمنا پہ کئے بیٹھا ہوں میں !
حسرتوں کے داغ — پہلو میں لئے بیٹھا ہوں میں !
نامرادی! — خون کے آنسو پئے بیٹھا ہوں میں !
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے ؟

(۲)

وہ فریبِ غمزہ ہائے حُسنِ بے پروا کہاں ؟
وہ طلسمِ انتظارِ وعدۂ فردا — کہاں ؟
میری دنیا اب "نیازِ عشق کی دنیا — کہاں ؟
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے ؟

(۳)

اب کہاں ؟ وہ محشرِ امید و بیمِ آرزو !
اب کہاں ؟ جذبات کو بیتابیوں کی جستجو !
اب تو میں ہوں ، اور گریباں کے لئے شغلِ رفو !
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے؟

(۴)

التفاتِ حسنِ ہرجائی کو — مدت ہو چکی !
حسرتوں کی محفل آرائی کو — مدت ہو چکی !
داغِ الفت — تیری رسوائی کو مدت ہو چکی !!
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے ؟

(۵)

آہ! وہ آغازِ الفت کا زمانہ — اب کہاں؟
اور انجامِ محبت کا فسانہ — اب کہاں؟
وہ "محبت"، وہ "محبت کا بہانہ"!! اب کہاں؟
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے؟

(۶)

شعلہ ہائے شمع ہستی میں تپش باقی نہیں!
کائناتِ دل کو ارمانِ خلش — باقی نہیں!
"درد" میں میرے لئے کوئی کشش باقی نہیں!!
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے؟

(۷)

منظر بربادیٔ دُنیائے الفت! یاد ہے!
کسطرح سے ہو گیا تھا خونِ حسرت! یاد ہے!!
یاد ہے — وہ "اُنکا انکارِ محبت"! یاد ہے!!!
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے؟

(۸)

روح افسردہ ہے — ارمانِ محبت کی طرح!
دل ہے ٹکڑے ٹکڑے، پیمانِ محبت کی طرح!
جی رہا ہوں! اک پشیمانِ محبت کی طرح!
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے؟

روش صدیقی

قطعاً تعمیل نہیں ہو سکتی

اگر آپ نے اپنا نمبر خریداری خط و کتابت میں درج نہیں کیا۔ منیجر "نگار" لکھنؤ

تیتری

اے حسن کی شانِ اجتماعی — پروردۂ صد بہارِ خوبی
نقاش کی صنعتِ مکمل — اے پیکرِ جنبشِ مسلسل،
یہ نقشِ حسیں پروں پہ تیرے — جیسے کوئی حور مسکرا دے
بے باک چمن میں گھومتی ہے — پھولوں کے لبوں کو چومتی ہے
یہ بادِ صبا کے نرم جھونکے — فردوس کے کھل گئے دریچے
ایسے میں ترے پروں کی جنبش — ہوتی ہے بجلیوں کی بارش
پھرتی ہے چمن کی ہر روش پر — شبنم سے بدن بچا بچا کر
اللہ رے ترا غرور کافر — رکھتی نہیں پاؤں بھی زمیں پر
شفاف بدن۔ لباس زریں — اُس پر یہ ترا خرام رنگیں
اِک پیکرِ حسنِ رنگ و بو ہے — یا بادۂ آب و تاب تو ہے
بدمست شمیم ہو نہ جانا — دامن میں گلوں کے سو نہ جانا

منظور حسین ماہر انصاروی

دردِ زندگی

(۱)

یہ مانا رازِ ہستی فہم انسانی سے باہر ہے — تو آخر میرے دردِ زندگی کی ہو دوا کیونکر؟
مگر بھولے سے بھی درماں نہ دنیا سے طلب کرنا — مجازی، یاد رکھ، ایسی دوا سے درد ہی بہتر!

(۲)

گر تجھ کو میں چاہوں، اے دنیا، تو تیری مرضی سب جھوٹی ہیں — گر تجھ کو میں چھوڑوں، اے دنیا، تو چھوڑ کے تجھکو جاؤں کدھر؟
ہے تیری خمیر سے یہ فطرت، فطرت نے مجھے مجبور کیا — ہستی ہی نہ ہوتی کاش مری، یا تو ہی نہ ہوتی فتنہ گر!!

مجازی لکھنوی

میکشانِ فطرت

شرابِ نابِ تجلی کے پینے والے ہیں!
وہ رند ہم ہیں مہ و مہر جنکے پیالے ہیں

ہمارے حلق میں گرتی ہے تاک انجم سے
ہمارے عیش کے سامان ہی نرالے ہیں

خزاں کے نام سے نا آشنا ہے جنکی بہار
ہمارے سامنے شام و سحر کے لالے ہیں

ستارہ صبح کا رقصاں ہے جنکو سُن سُن کر
ربابِ دل ہی کے وہ پُرسرور نالے ہیں

ہمیں زمان و مکاں کی ہے ماہیت معلوم
کہ ہم جہانِ تخیل کے رہنے والے ہیں

خودی کا نام نہ لو، ماسوا کو رہنے دو،
بربِ کعبہ یہ بُت سب ہمیں نے ڈھالے ہیں

نگاہ اپنی ہے انجامِ خندۂ گُل پر
ابھی چمن کا تبسم ہمیں سنبھالے ہیں

امین حزیں

غزل ضیا اٹکوری

ہر چند خطرۂ ستمِ باغباں نہیں
لیکن یہ جانتا ہوں قفس آشیاں نہیں

سوا اضطراب پر بھی ہیں مجبورِ خامشی
اللہ کیا ہمارے دہن میں زباں نہیں

اک دورِ کشمکش تھا جو آخر گزر گیا
اب یاد قصۂ قفس و آشیاں نہیں

کیا حشر ہوگا اس دلِ حسرت نصیب کا — تابِ الم نہیں جسے حکمِ فغاں نہیں
قیمت اوہنی کی تھی جو ہوئے برق کو عزیز — ہر تنکے سے مرادِ خسِ آشیاں نہیں
رہتا ہے ایک جلوۂ رنگیں نگاہ میں — مجھکو دماغِ سیرِ گل و گلستاں نہیں

اب لطفِ اضطراب میسر کہاں ضیا
گلشن نہیں۔ بہار نہیں۔ آشیاں نہیں

غزل فرخ بنارسی

اُف رے وہ کیف جو پنہاں نگہ ناز میں ہے، — ایک نغمہ ہے کہ خوابیدہ رگِ ساز میں ہے
ساز ہے سوز میں اور سوز نہاں ساز میں ہے، — حسن اور عشق میں جو ربط ہے وہ راز میں ہے
جاذبِ ذوقِ سماعت ہے نوائے فطرت، — رازِ تسکینِ دل اس نغمۂ بے ساز میں ہے
ہے اسیری میں بھی سرگرم خلشِ بادِ چمن — ایک رعشہ سا ابھی تک پرِ پرواز میں ہے
ختم ہونے پہ ہیں دنیائے محبت کی حدیں — قدمِ شوق ابھی منزلِ آغاز میں ہے
حیرتِ حسن ذرا دید کی فرصت بھی تو دے — کیا بتاؤں ابھی کیا جلوہ گہِ ناز میں ہے
جاذبِ روح ہیں یوں تو مے و نغمہ بھی مگر — اور ہی کیف نگاہِ غلط انداز میں ہے
نالہ و نغمہ برابر کا اثر رکھتے ہیں — فرق نازک سا مگر دونوں کی آواز میں ہے
خرمنِ ہستیٔ عشاق سے اٹھتا ہے دھواں — اور ابھی برق نظر پردۂ صد ناز میں ہے
محرمِ رازِ حقیقت نہیں کوئی ورنہ — نغمۂ حسنِ ازل پردۂ ہر ساز میں ہے
حسن کی کچھ تو جھلک اہلِ نظر نے دیکھی — جلوۂ عشق ابھی پردہ گہِ راز میں ہے
ذرہ ذرہ کششِ حسن سے ہے سر بسجود — جلوہ گر کون حسیں انجمنِ ناز میں ہے

عینِ ایماں ہے مری کفر پرستی فرخ
شانِ حق جلوۂ حسنِ بتِ طناز میں ہے

مولانا شبلی

- سیرۃ النبی جلد اول — عمہ
- ” دوم — صہ
- ” سوم — معہ
- الفاروق — ؏ و ے
- سیرۃ النعمان — عہ
- الغزالی — عہ
- المامون — عہ
- سوانح مولانا روم — عہ
- سفرنامہ مصر و شام — عہ و ؏
- علم الکلام — عہ و ؏
- الکلام — عہ و ؏
- رسائل شبلی — عہ
- مقالات شبلی — عہ
- شعر العجم جلد اول — ۱۲ ؏
- ” دوم — ۸ ؏
- ” سوم — ۸ ؏
- ” چہارم — ۸ ؏
- ” پنجم — ۱۲ عہ
- موازنہ انیس و دبیر — ے
- مضامین عالمگیر — عہ و ۱۲
- آغاز اسلام — ۱۲ و ۸
- کلیات فارسی شبلی — ؏
- کلام شبلی اردو — عہ و ۸

رتن ناتھ سرشار

- سیر کہسار — ے
- خدائی فوجدار — عہ
- جام سرشار — ؏
- الف لیلہ بطرز ناول — صہ
- کامنی — عہ

- سوانح عمر و عیار — عہ

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذی — ۸ر
- حاجی بغلول — ۸ر
- پیاری دنیا — ۸ر
- کایا پلٹ — ۸ر
- میٹھی چھری — ۶ر
- طرحدار لونڈی — عہ
- طلسمی فانوس — ۱۲ عہ

جوالا پرشاد برق

- مزنالنی — ۱۰ر
- مار آستین — ۱۰ر
- بنگالی دولہن — ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ — ۸ر
- پرتاب — ۱۲ر
- روہنی — ۱۰ر

مولانا شرر مرحوم

- جنید بغدادی — عہ
- ملک زونوبیہ — ۴ر
- قرۃ العین — ۴ر
- مخدرات — عہ
- جویائے حق — للعہ
- لعبت چین — عہ
- فاتح و مفتوح — عہ
- بابک خرمی — عہ
- الفانسو — ۱۲ر
- ایام عرب — ؏
- قیس و لبنیٰ — عہ
- یوسف و نجمہ — عہ
- زوال بغداد — عہ

- مینا بازار — عہ
- مقدس نازنین — عہ
- رومتہ الکبریٰ — عہ
- فلپانا — عہ
- شوقین ملکہ — عہ
- منصور موہنا — ۸ر
- حسن انجلینا — ۸ر
- ملک العزیز ورجنا — ۱۲ر
- فردوس بریں — ۸ر
- حسن کا ڈاکو — عہ
- دربار حرام پور — ۱۰ر
- غیب دان دولہن — عہ
- بدر النساء کی مصیبت — ۴ر
- میوۂ تلخ — ۸ر
- نیکی کا پھل — عہ

شوق قدوائی

- ترانۂ شوق — عہ
- قاسم و زہرہ — ۱۲ و عہ
- نیرنگ جمال — ۴ر

ظفر عمر بی اے

- چوروں کا کلب — ۹ر
- نیلی چھتری — عہ
- بہرام کی گرفتاری — عہ

دلچسپ تاریخی و جاسوسی ناول

- شعلۂ رنگین — ۸ر
- محاصرۂ پیرس — عہ
- شیخ چلی — عہ
- بہرام کی واپسی — ۴ر
- انقلاب فرانس — عہ
- حسن بنارس — ۸ر

- فطرتی جاسوس — عہ
- ترکی حرم سرا — ۸ر
- جنگ طرابلس — ۸ر
- بہرام چور — عہ
- زر پرست — عہ
- کنجی کا راز — عہ
- عبدالرحمن ناصر — ؏
- عروس مصر — ؏
- سیلاب خون — عہ
- سیاحت زمین — عہ
- سیاحت ہوا — عہ
- نازنین مراکش — ۸ر
- سمندر کی سیر — ؏
- اسرار بالشویزم — عہ
- روح لیلیٰ — ے
- آئین بک — عہ
- حجاج بن یوسف — عہ
- یوسف پاشا — عہ
- انقلاب عثمانی — عہ
- بہرام کی رہائی — عہ
- بہرام کی آزادی — ۱۲ر
- بہرام کی سرگزشت — عہ
- لال کنٹھو — عہ
- پر اسرار قتل — ؏

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب — ے
- بزم خیال — عہ
- نشاط سخن — عہ
- انشار نسواں — ۶ر
- مکاتیب محسن الملک — عہ

- لیلیٰ مجنوں ڈراما — ۸ر

مراثی

- مراثی دبیر — ؏
- مراثی انیس — للعہ
- مراثی ضمیر — عہ
- مراثی مونس — ۱۲ ے
- مراثی دلگیر — ۱۲ ے

تذکرۃ الشعراء

- تذکرۂ حسینی — ۱۱ر

گلشن

- ۱۰ر
- سراپائے سخن — عہ
- سوانح نظیر اکبرآبادی — ؏

دواوین فارسی

- دیوان شمس تبریز — ۱۲ عہ
- کلیات عراقی — ۱۲ر
- دیوان حافظ — عہ
- دیوان بیدل — عہ
- دیوان عرفی — ۱۲ر
- کلیات جامی — عہ
- کلیات غالب — عہ
- کلیات صائب — ۱۲ عہ
- دیوان ناصر علی — ۶ر
- کلیات سعدی — عہ
- کلیات حزیں — ۱۲ ؏
- دیوان عنصری — ۱۴ر
- دیوان غنی کشمیری — ۶ر
- دیوان ہلالی — ۶ر

دواوین اردو

- کلیات ظفر — ۱۲ ؏
- کلیات مومن — عہ

- دیوان ناسخ — عہ
- کلیات میر — عہ
- کلیات سودا — عہ
- کلیات انشا — عہ
- کلیات نظیر اکبرآبادی — عہ
- گلزار داغ — عہ
- دیوان رند — ۹ر
- دیوان ذوق — ۱۲ر
- کلیات اسمٰعیل — ؏
- مراۃ الغیب — عہ
- صنمخانۂ عشق — ؏
- فریاد داغ — ۴ر
- دیوان قائل — ۸ر
- دیوان شہیدی — ۴ر

عجائب و غرائب

- عجائب المخلوقات، تصویر رنگین — عہ
- ” با تصویر سادہ — للعہ
- مجمع الفنون — ے
- طلسم فرنگ — ؏
- کارخانۂ عالم — عہ

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

- الہ دین دیلی — ۱۲ر
- فریب حسن — ؏
- سوزن عشق — عہ
- روز الیمبرٹ — للعہ
- ناول امراؤ — ؏
- شام جوانی — ے
- شمع فانوس — ۱۲ر

نگار بک ایجنسی غظر آباد لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر ا ے ۱۱۰۴

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

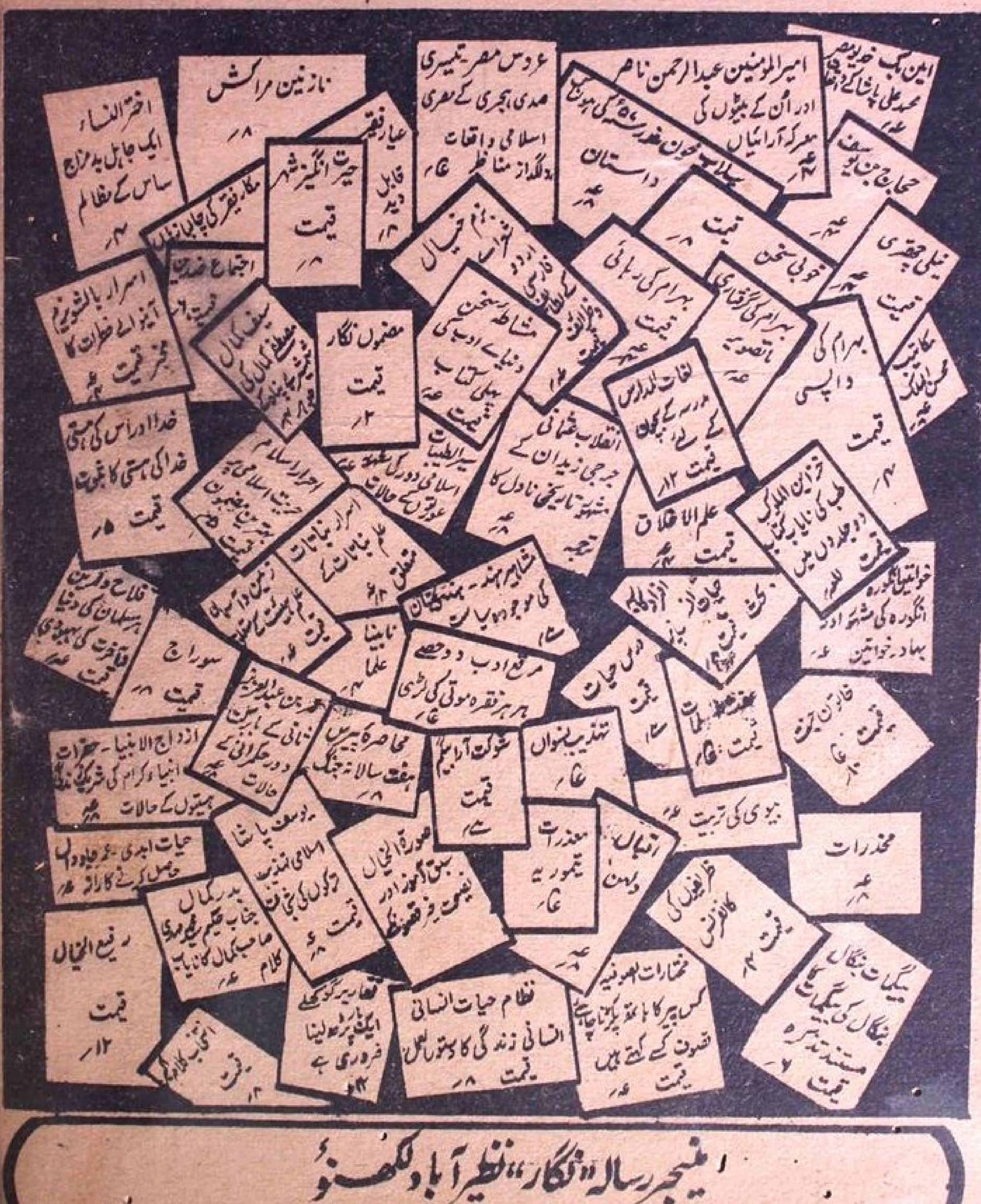

منیجر رسالہ "نگار" نظیر آباد لکھنؤ